

# دل سے دار تک

(کہانیوں کا مجموعہ)

فریدہ زین

# جملہ حقوق بحق مصنفہ محفوظ

سنہ اشاعت	۱۹۸۲ء
تعداد	ایک ہزار
کتابت	محمد عارف الدین
طابع	نیشنل فائن پرنٹنگ پریس، چارکمان، حیدرآباد
جلد بند	حفیظہ بک ہائسنگ، یوسف بازار، حیدرآباد
قیمت	دس روپے

معاونت اردو اکیڈمی حیدرآباد، آندھرا پردیش

حلنے کا پتہ :

- اردو اکیڈمی حیدرآباد، آندھرا پردیش۔
- ایلاس ٹریڈرس، شاہ علی بندہ، حیدرآباد
- محمد زین العابدین سعید ایڈوکیٹ، بھونگیر، ضلع نلگنڈہ
- مصنفہ :- فریدہ زین پرنسپل، فلاورزون اسکول، ۴۹ - ۵ - ۱۱ ریڈ ہلز

حیدرآباد - ۴۰۰۰۵

# انشاب

اپنے رفیق و رہنما، محسن و کرم فرما

محمد زین العابدین سعید ایڈوکیٹ

کے نام

جن کی شخصیت زندگی کی تیز دھوپ میں گھنی چھاؤں کا احساس دلاتی ہے

(اور)

جن کی رفاقت نے میرے قلم کو زندگی بخشی،

فراہم کر کے میرے دل کے اجزائے پریشاں کو  
مری بکھری ہوئی ہستی کو صورت بخش دی تو نے  
کہاں باقی رہا تھا زندگی کا حوصلہ مجھ میں  
مجھے اک بار پھر جینے کی ہمت بخش دی تو نے  
وہ غم ہو یا مسرت ہو، وہ مرنا ہو کہ جینا ہو  
مجھے ہر حال میں اپنی ضرورت بخش دی تو نے  
(جاں نثار اختر)

# فہرست

فریدہ زرین —————  
تخلیقی کہانی کی علامت

ڈاکٹر عنوان بہشتی، قائم مقام صدر شعبہ اردو  
جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی

- دل سے دارتک ————— ۷
- خوابوں کے کھنڈر ————— ۱۶
- چند اکی چاندنی ————— ۲۵
- دل ایک سجدہ گاہ ————— ۳۴
- پلکوں کی چھاؤں میں ————— ۴۵
- منزل ————— ۵۲
- بسیرا ————— ۶۲
- گھونگھٹ کی آچ ————— ۷۳
- لوہ کے رنگ ————— ۸۳
- چشمِ نم ————— ۸۸
- اور ہم اکیلے ہیں ————— ۱۰۳



# فریدہ زین — تخلیقی کہانی کی علامت

فریدہ زین اردو کی ان مخلص افسانہ نگاروں میں شامل ہیں جنہوں نے صلو و ستائش کی تمنا سے بے نیاز ہو کر نگار خانہٴ فکرو فن میں اپنے خونِ دل سے چراغاں کیا ہے۔ اس کے کئی وجوہ ہیں، ایک تو ان کی طبعی بے نیازی دوسرے ارباب فن کے بے توجہی، اس لئے انہوں نے بسترِ گل سے زیادہ قفس کے گوشے میں آرام محسوس کیا۔ لیکن اس واضح احتیاط سے ان کے فکرو فن کو نمی تو انائی ملی، جو ان کے افسانوں میں رومانی، سماجی اور نفسیاتی سطحوں پر جلوہ گر ہے۔ جہاں تک ان کے افسانوں کی رومانی فضا کا تعلق ہے اس میں رنگ افشاں جذبات مجروح تمناؤں، سسکتی آرزو اور متضاد کیفیات کے وہ سارے رنگ ملتے ہیں جو ان کے فن کو ایک اثر انگیز جذباتی اور رومانی طاقت عطا کرتے ہیں۔ اس رومانی و فور میں اگر ان کے جذباتی المیے کے سیاہ رنگ کو شامل کر لیں تو ان کی رومانیت کا رشتہ زندگی کی ان تلخ حقیقتوں میں پیوست ہو جاتا ہے جس کے بغیر فن میں تاثیر اور توانائی نہیں آسکتی۔ ان کی کہانیوں کو پڑھتے وقت ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے ان کے کردار بیک وقت کئی سطحوں پر جی رہے ہیں۔ اور ایک شدید جذباتی بحران کا شکار ہیں اس دور میں جب کہ انسان سیاسی، سماجی اور اقتصادی عذاب میں مبتلا ہے، ان کے کرداروں کی نفسیاتی پیچیدگی کا راز سمجھ میں آجاتا ہے۔ یہی نفسیاتی کشمکش، تضاد اور تصادم ان کی کہانیوں میں زندگی کی سچی معنویت اور فن کا راز بصیرت پیدا کرتی ہے۔

جہاں تک سماجی مسائل کا تعلق ہے فریدہ زین نے ایک احساس اور با شعور فن کار کی حیثیت سے اس دور کے عام انسان کے مسائل کو اپنا موضوعِ سخن بنایا ہے۔ بنیادی طور پر انہوں نے اپنی کہانیوں میں ان غریبوں، مزدوروں اور مفلسوں کی حالتِ کرداروں کے واقعات کے صحیح مناظر پیش کیا ہے جن کی کوششوں سے زندگی کے رُخ پر نور ہے، لیکن خود ان کے چہرہ

کا رنگ اڑ چکا ہے۔ ان کی کہانیوں میں سماجی شعور کا وہ رنگ بھی ملتا ہے جو فن کو زندگی سے وابستہ کر دیتا ہے۔

فریدہ زین اس نکتہ نگاہ سے آگاہ ہیں کہ افسانے میں کہانی پن اور تخلیقی زبان کو اہمیت حاصل ہے۔ ان کی کوئی کہانی پڑھیے اس میں کہانی پن کی وہ بنیادی خصوصیت ملے گی جس کے بغیر کہانی کا تصور نہیں کیا جاسکتا۔ اس لئے ان کی کہانیوں میں تسلسل، روانی، ترسیل فضا نیز دلکشی کے سارے رنگ اپنی پوری تابانی کے ساتھ جلوہ گر ہیں۔ اس کے ساتھ انھوں نے اپنے جمالیاتی تجربوں کو جو زبان عطا کی ہے وہ ایک ایسی تخلیقی زبان ہے جس میں حسن ہی حسن ہے۔ انھوں نے الفاظ کو جادو بنا دیا ہے۔ ان کو لغت سے اٹھا کر زندگی کا منظر بنایا ہے۔ ان کی ترکیبوں میں فنکارانہ حسن ہے۔ تشبیہوں اور استعاروں کی فضا میں وہ رنگ سامانی ہے جو فن پر مشک نانی کی طرح اپنے معانی کے ساتھ ”آئندہ“ اور جمالیاتی کیفیت کے لئے امکانات کا انکشاف کرتی ہیں۔ اسلوب کی نرمی، دل گدازی، شگفتگی اور سادگی اس کو سحر لال بنا دیتی ہے جس کی حدیں تشری شاعری سے مل جاتی ہیں۔

فریدہ زین کی پہلی کتاب ”سسکتی چاندنی“ کی رسم اجرا کے موقع پر میں نے کہا تھا فریدہ زین کا فنی سفر ابھی رومان کے دھند لکوں میں جاری ہے۔ لیکن ”دل سے دار تک“ کے مطالعے سے واضح ہوتا ہے کہ اب ان میں رومان کے دھند لکوں سے نکلنے کا حوصلہ پیدا ہو گیا ہے۔ اور وہ حقائق کی تیز دھوپ میں سنگلاخ زمینوں کے سفر کو اپنا نقطہ آغاز بنا چکی ہیں۔

مجھے یقین ہے کہ ان کی کہانیوں کا دوسرا مجموعہ ”دل سے دار تک“ ارباب ذوق میں مقبول ہوگا اور وہ اپنا فن کارانہ سفر پورے خلوص، انہماک اور لگن سے جاری رکھیں گی، جس کا کریڈٹ ہمیشہ کی طرح جناب زین العابدین سعید ایڈوکیٹ کو ملے گا۔

**ڈاکٹر عنوان حشری**

بتاریخ ۶ ستمبر ۱۹۸۲ء

قائم مقام صدر شعبہ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ  
نئی دہلی

## دل سے دارتک

صحن کے بچوں بیچ خالو ابا کرسی پر بیٹھے معمول کے حل تلاش کر رہے تھے۔ جاوید بھائی ورنڈے میں بیٹھے ریڈیو سُن رہے تھے۔ بھابی قریب ہی بیٹھی سوئیٹر بن رہی تھیں۔ شاید کسی نئے مہمان کی آمد تھی۔ سیما اور نیاز آنکھ مچولی کھیل رہے تھے۔ نایہ آم کے درخت سے ٹیک لگائے گنگنا رہی تھی۔ صحن میں پھیلی ہوئی ٹیوب لائٹ کی روشنی پر چاندنی اُتر آنے کا گمان ہو رہا تھا۔

”ہندوپاک کے درمیان مراسلت تو شروع ہو گئی۔ اب خیر سے آمد و رفت بھی شروع ہو جائے گی۔“

خالد اُچی تسبیح ڈھالتی ورنڈے سے اتر کر یہ کہتی ہوئی خالو ابا کے قریب کرسی پر جا بیٹھیں۔ ٹھیک اُسی وقت کال بل بج اٹھی۔ جاوید بھائی بادل ناخواستہ اٹھ کھڑے ہوئے، باہر کھدواڑہ کھولا اور چند لمحوں کے لئے جیسے کھو سے گئے۔

”ارے امان — تم —“ وہ آنے والے سے لپٹ گئے۔

”اُمی دیکھو تو کون آیا ہے — انھوں نے اندر آتے ہوئے کہا۔

”کون —!! ارے امان — تم“ اور امان نے بزرگوں کے آگے

سرنیاز جھکا دیا۔

”جیتے رہو سدا سکتی رہو۔“ خالا اتی نے بلائیں لے ڈالیں۔

”اچانک غیر متوقع اتنے سال بعد کیسے آگئے بیٹا۔ کہاں رہ گئے تھے اتنے سال“ خالو ابانے سینے سے لگا کر کہا۔

”بس یہ مت پوچھئے۔ زندگی میں بہت سی مشکلیں اٹھائیں۔ انسان ہنسنے کی کوشش کی اور کافی جدوجہد کے بعد آج اس قابل ہوا کہ آپ کے پاس آسکوں۔“ اماں نے جواب دیا۔

”اسخ کیا کرتے رہے اتنے سال۔۔۔ کہاں رہ گئے تھے؟“ خالا اتی نے سوال کیا۔

”جب یہاں سے چلا تو صرف میٹرک ہی نکال سکا تھا مگر جانے کراچی کا کمال تھا یا تقدیر کا انقلاب۔“ مجھ میں ایک نیا جذبہ اور جوش پیدا ہو گیا۔ محنت کی اور آپ کی دعا سے اب انجنیئر ہوں ایک سال ہوا امریکہ میں مقیم ہوں۔“ اماں نے کہا۔

”تم انجنیئر ہو گئے۔۔۔! امریکہ چلے گئے۔“

خالو اتی کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ بات تعجب ہی کی تو تھی کون سوچ سکتا تھا کہ اماں جیسا لاابالی اور شرارتی لڑکا کچھ بن سکے گا۔

”یہاں سب تو اچھے ہوں گے نا۔۔۔“ اماں کی نظریں کسی کو ڈھونڈ رہی تھیں۔

”بیٹی نایلہ یہاں آؤ۔“ خالو ابانے آواز دی۔ سفید کپڑوں میں ملبوس وہ

چلی آئی۔

”آداب عرض ہے اماں بھائی۔“ اس نے کہا۔

”خوش رہو۔ کہو کسی ہو۔ بڑی تبدیلی آگئی ہے تم میں۔“

امان نے اسے غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔ اُسی وقت باورچی خانے میں چھین کی آواز آئی۔

”کیا ٹوٹ گیا۔۔۔“ خالاتی نے پکار کر پوچھا

”جی۔۔۔ کچھ نہیں۔۔۔ وہ۔۔۔ پلیٹ۔۔۔“

باورچی خانے سے مدھرتان سنائی دی۔

”کیا کر رہی ہو نایلہ آج کل“

”بے کار ہوں۔ گرجولیشن تو کر لیا۔“

”اچھا۔۔۔!“ وہ بھی لمبی سانس لے کر ادھر ادھر دیکھنے لگا۔

”ٹیبیل پر کھانا لگ چکا ہے۔“ اندر سے چھروہی سرٹلی تان گونجی۔ جیسے دیر نے

میں کوئل کوک اٹھی ہو۔ ہاتھ دھو کر جیسے ہی امان ٹیبیل کے قریب پہنچا، اس کی نگاہ  
تھم گئی۔ ہلکے زرد رنگ کی ساڑھی میں وہ دہکتا شعلہ بنی کھڑی تھی۔ زلفیں دوش پر  
بکھری ہوئی تھیں۔ نظریں جھکی جھکی، لب بند، ماتھے پر پسینے کے چمکتے قطرے اور  
گال شفق کے رنگ میں ڈوبے ہوئے۔ قوس قزح کے ساتوں رنگ سیٹھے اس پیکر  
کو دیکھ کر امان فرط مسرت سے بے قابو ہو گیا۔

”دلبر۔۔۔ تم۔۔۔ میں کتنی دیر سے انتظار کر رہا تھا تمہارا“

”آداب۔۔۔“ انگلیوں کو جنبش ہوئی اور لب گویا ہوئے۔

”کیسی ہو۔۔۔“

”اچھی ہوں۔“ سارے دھیمے سروں میں بج رہا تھا۔

”اور سناؤ بیٹا وہاں کے حالات۔۔۔“ خالو ابانے موزوں بدل دیا۔ امان

مجبوراً اپنی توجہ ہٹا پایا۔ کھانا ختم ہوا تو سب اٹھ گئے۔

”تمہارا دلبر ٹیبیل صاف کرتی رہی اور تصور میں رنگِ حنا کے گل بوٹے دیکھتی رہی۔“

”دلبر —“ خالو ابا کی آواز پر وہ چونک گئی۔

”یہاں آؤ۔ انھوں نے آواز دی وہ ان کے کمرے میں پہنچی۔ وہاں صرف خالو ابا اور خالا اتی ہی تھے۔

”بیٹھو بیٹی۔“ خالو ابا کا یہ پیار بھرا لہجہ اُسے عجیب سا دکھائی دیا۔

”بیٹی۔ میں جانتا ہوں تمہاری ماں نے تمہیں امان سے منسوب کیا تھا۔ اور

مرتبہ وقت ہم سے کہا تھا کہ جب تک تمہارا بیاہ امان سے نہ ہو جائے، ہم نایکہ کے

بارے میں نہ سوچیں۔ تمہاری ماں کے مرنے کے بعد ہمیں نے تم کو بیٹی کی طرح پالا۔“

وہ رک گئے اور دلبر سوچنے لگی۔ ”بیٹی اور باندی میں کیا فرق ہوتا ہے۔

امان کی فطرت بڑی لالہ بالی تھی۔ اس نے زندگی کو کبھی سنجیدگی سے نہیں دیکھا

ہم چاہتے تھے کہ تمہاری شادی جلد سے جلد امان سے کر دیں، مگر وہ اس قابل ہی

نہیں تھا۔ — پھر اچانک ایک دن وہ کہیں چلا گیا۔ اس کے انتظار میں ہم نے

تمہارا بیاہ نہ کیا اور نایکہ کی عمر تمہارے لئے برباد ہوتی رہی۔ رفتہ رفتہ اچھے پیامات

ختم ہو گئے۔ مطالبات بڑھ گئے۔ نایکہ جیسی تعلیم یافتہ لڑکی کے لئے تو ایسا لڑکا

چاہیے جیسا . . . . . جیسا کہ امان ہے۔“

وہ رک گئے۔ خالا اتی کی تسخ زور زور سے ہلنے لگی۔ خالا اتی کی تسخ زور زور سے

ہلنے لگی اور دلبر کی تیز نبض چلتے چلتے رکنے کے قریب آگئی۔ اس نے کھوئی کھوئی نظروں سے

خالو ابا کی طرف دیکھا۔

”اماں انجینئر ہے امریکہ میں رہتا ہے، اسے کوئی سوشل تعلیم یافتہ لڑکی چاہئے

تم . . . . . تم تو صرف ساتویں تک ہی تعلیم حاصل کر سکی ہو۔“

خالو ابا کے رُکے لہجے میں کہہ رہے تھے اور دلبر سوچنے لگی کہ وہ ساتویں سے

آگے کیوں نہیں پڑھ سکی تھی۔

اب اسے پڑھا کر نایلہ کو چوٹھے کے پاس بھجواؤ گے کیا۔ آخر گھر کے خرچ میں کچھ تو بچت چاہیے۔ یہ لڑکی بلا مصرف یہاں کیا کرے گی۔ لگا دو اسے چوٹھے پر۔“

خالو ابانے ساتویں درجے کی رپورٹ اس کے ہاتھ سے چھین کر پھینکتے ہوئے کہا

تھا، ایک مرد آہ اس کے دل سے نکلی گئی۔

”تم تو ایک یتیم لڑکی تھیں۔ ہم نے تم پر ترس کھا کر سہارا نہ دیا ہوتا تو کیا ہوتا۔  
 ویسے میں احسان گنوانے والا نہیں، صرف بات سمجھانے کی کوشش کر رہا ہوں۔“  
 خالو آبا کہے جا رہے تھے۔ اور وہ بت بنی سنی جا رہی تھی۔

”میں چاہتا ہوں نایبہ امان سے بیاہی جائے۔ تمہارے لئے اس کی عمر خراب ہوئی، اچھے پیامات نامنظور ہوئے اس غلطی کی یہی تلافی ہے نایبہ کے لئے امان سے بہتر کوئی اور نہیں۔ تم نایبہ کی بہن ہو، سگی نہ سہی، خالانازد سہی۔ کیا تم اس کی خوشی کے لئے اس بات کو قبول نہیں کرو گی۔“

خالو! بانی سوال کیا اور دلبر نے گردن جھکالی بالکل ایسے ہی جیسے دار پر چڑھنے سے پہلے ملزم کا سر خم ہو جاتا ہے۔

”اب رہا تمہاری شادی کا معاملہ تو نایلہ کی شادی کے بعد کسی بھی جگہ تمہارا رشتہ طے کر دیں گے۔“ خالو ابانے تسلی دی۔ جیسے معصوم بچے کے ٹوٹے کھلونے کو دیکھ کر کوئی اس سے دوسرا کھلونا لانے کا وعدہ کر لے۔

”تم چپ کیوں ہو۔۔۔؟ جواب دو۔“ خالاحی نے زبان کھولی۔  
 ”میں۔۔۔ میں کیا کہوں۔“ اس نے کہا۔ بڑی دیر سے تھا اچھا اکبوتر اُڑ

چکاتھا۔

”اس کے لئے تمہیں اپنے آپ کو بدلنا ہوگا“ خالامی نے سرگوشی کی۔

7

”ہم امان سے کہہ دیں گے کہ تمہاری شادی ہو چکی ہے اور تم ..... تم بیوہ ہو گئی ہو۔“ خالو ابا کے دل کی جگہ پتھر اچکا تھا۔

”نہیں۔۔۔ ایسا نہ کہئے۔ اتنا منحوس لفظ مجھ سے وابستہ نہ کیجئے کیونکہ ..... کیونکہ میں چند لمحے پہلے بھی ان سے منسوب رہی ہوں۔“ دلبر تڑپ گئی۔

”کیا ہماری ہمدردیوں کا یہی معاوضہ دے رہی ہو .....!!“  
خالو اتنی نے تیوری چڑھا کر کہا۔

”معاوضہ ..... ہونہ۔“ وہ بے دلی سے مسکرا پڑی۔ جیسے کوئی بہادر سپاہی موت کو سامنے دیکھ کر بھی ہنس دیتا ہے۔

”آپ ان سے کہہ دیجئے کہ میری شادی ہو چکی ہے، اور میرا شریک حیات تلاش روزگار میں کہیں گیا ہوا ہے۔“ دلبر نے قصہ مکمل کر دیا۔

”خوش رہو بیٹی۔ اللہ تمہیں اس کا اجر دے گا۔ ہر ماں اپنی بیٹی کا بھلا ہی چاہتی ہے۔“ خالو اتنی نے بلائیں لے ڈالیں۔ دلبر دھیرے دھیرے قدم اٹھاتی مگر سے نکل گئی۔ کاش اس کی ماں ہوتی۔ یہ سوچتی ہوتی وہ اندھیرے میں کسی چیز سے ٹکرا گئی۔

”دلبر۔۔۔“ یہ سرگوشی امان کی تھی۔

”آپ .....“ اس کے جسم پر چیونٹیاں رینگنے لگیں۔ خالو ابا سے کیا ہوا وعدہ اسے یاد آگیا۔

”ٹہنے مجھ راستہ دیجئے۔“ دل پر قابو رکھتے ہوئے اس نے کہا۔  
”اتنی بے رخی، اس قدر خفگی ناراض ہو مجھ سے۔ لیکن دلبر اتنی دُور رہ کر بھی تم سے ایک پل کے لئے دور نہ ہو سکا۔“ امان کے لہجے میں درد سمٹ آیا۔  
”بہت دیر کر دی نے آپ نے۔ کوئی کسی کا انتظار اتنے۔۔۔۔۔ نہیں کرتا۔“



میں بھی مجبور تھی۔ میں نے بھی — ساتھی ڈھونڈ لیا۔“ تھر تھراتے لبوں سے نکلے ہوئے ان جلوں نے تصور کا سُرخ گھونگھٹ تار تار کر دیا۔

”اوہ — تو تم — میرا انتظار نہ کر سکیں اور میں دس سال سے تمہاری تصویر کو دل کے فریم میں سجا کر پوجتا رہا۔“

”میں کیا کرتی کب تک راہ نکلتی —؟“ دلبر بہ مشکل تمام کہہ سکی، اور تیزی سے اپنے کمرے کا دروازہ بند کر لیا۔ گویا امان کے لئے اپنا در دل بند کر ڈالا۔ صبح سویرے سب نے دلبر میں ایک عجیب سی تبدیلی دیکھی۔ اس کے جسم پر کلابی چم چماتی ساڑھی تھی۔ ہاتھوں میں سُرخ چوڑیاں آنکھوں میں کاجل ہونٹوں پر سرخی اور ان سب سے ہٹ کر وہ روایتی سیاہ موتیوں کی مالا جو سہاگنی کی نشانی ہے۔ اس کی گردن کو چوم رہی تھی۔ خالو ابا نہال ہو گئے۔ امان اُداس ہو گیا۔

”دلبر کی شادی پر ہم نہیں کارڈ بھجوانہ سکے، تمہارا پتہ ہی نہیں معلوم تھا۔“ خالو امانی نے درد بھرے تاروں کو چھیڑ دیا۔ امان نے دلبر کی جانب دیکھا۔ گویا پوچھنا چاہتا ہو کیا وہ اس کے قفس دل سے پرواز کر گیا ہے۔ دلبر نے سر جھکا لیا جیسے کوئی بے گناہ ملزم بے چارگی سے اپنا فیصلہ سن لیتا ہے۔

”دلبر کے لئے پیامات کی کمی ہی نہ تھی۔ لوگوں کے بڑھتے تقاضوں پر دلبر کی ایما سے ہی ہم نے اس کا رشتہ طے کر دیا۔“ خالو ابا کہنے لگے۔

”خالو ابا پلیز! اس بحث کو رہنے دیجئے۔ آئیے جاوید بھائی کہیں باہر چلیں۔۔۔۔“ امان مزید ٹھیرنے کی تاب نہ رکھتا تھا۔

”بیٹے جاوید۔ نایلو کو بھی ساتھ لے جاؤ۔ وہ گھر میں پڑی بور ہو جاتی ہے۔“ خالو ابا راستہ ہموار کر رہے تھے۔ دلبر بہت دیر تک سب کو جاتے ہوئے دیکھتی رہی۔ پھر دلبر نے محسوس کیا امان کی نگاہوں میں اس کے لئے نفرت گہری ہوتی جا رہی

ہے اور ناپلہ کے ساتھ اس کی دلچسپی بڑھتی جا رہی ہے۔ ہر شام وہ ایک ساتھ تفریح کو نکلتے دن بھر کمرے میں گپیں ہانکتے۔ کبھی تھپتھپے کبھی سرگوشیاں اُبھرتیں۔ دلبر کو یوں لگتا جیسے وہ دلدل میں دھنسی جا رہی ہے۔

اور پھر ایک دن .... اماں اور ناپلہ راہ زیست کے ہمسفر ہو گئے۔ ازدواجی بندھن میں بندھ جانے کے بعد اماں اسے جلد سے جلد امریکہ لے جانا چاہتا تھا۔ خالو ابا کا تیر نشانے پر بیٹھ گیا۔ دلبر کی تنہائیاں لامتناہی ہو گئیں۔

آخر کار وہ دن بھی آیا جب اماں ناپلہ کے ہمراہ پرواز کرنے والا تھا۔ دلبر ریلنگ کو تھا مے آسمان کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں شکایت اور ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔ دفعتاً اماں کی آواز پر وہ چونک گئی۔

”دلبر —“ اس آواز پر وہ یوں پلٹ گئی جیسے اس کی ساری خوشی یہیں آکر ختم گئی ہو اور وہ اسے بڑھ کر لے لینا چاہتی ہو۔

”نام بنتا دلکش ہے کردار اتنا ہی پُر فریب۔“

نفرت میں ڈوبا ہوا پہلا تیر اماں کی زبان سے چھوٹا۔

”تم خود کو جانے کیا سمجھتی ہو۔ شاید دنیا کا سب سے حسین پیکر تھیں۔ شاید یہ پتہ نہیں میں نے تم سے بھی زیادہ حسین بُت دیکھے لیکن سجدہ کرنے جی نہیں چاہا۔ اس لئے کہ میں ایسے منہم کی پوجا کرتا تھا جو پتھر کا بنا تھا۔ اچھا ہوا کہ میرے اس زخم کو ناپلہ مریم کی شکل میں مل گئی۔ تم نے میرے پیار، میری چاہت، میری محبت کو کھیل سمجھا۔۔۔ ریت کے گھروندے کی طرح ڈھادیا۔ پانی کے بلبلے کی طرح پھونک دیا۔ شمع کی لو کی طرح بجھا دیا۔ تم عورت کے نام پر ایک داغ ہو میں نے دس سال کا ہر لمحہ تمہاری یاد سے وابستہ رکھا۔ جدائی کے درد کو تمہارے پیار کے نام پر امت سمجھ کر پتیا رہا۔ لیکن اب میں تم سے نفرت کرتا ہوں۔ دفائیں کھیل نہیں ہوتیں۔ عمر کے جینے کا نام ہی

وفا ہے، اور تم — تم صرف بے وفا ہو صرف بے وفا —  
 کسی جہیب طوفان کی طرح گرج کر، برس کر، تیز تیز قدم اٹھاتا۔ وہ رن وے  
 کی جانب بڑھ گیا، جہاں نایلو اس کا انتظار کر رہی تھی۔ دلبر آنکھیں بند کئے سب کچھ  
 سنتی رہی جب امان نے اُسے 'بے وفا' کہا تو یوں لگا جیسے کسی نے دل دینے کی  
 سزا میں اسے دار پر چڑھا دیا ہے اس نے ہاتھ بڑھا کر گلے میں پڑی سیاہ موتیوں  
 کی روایتی حالاکھنچ ڈالی۔ کلائیوں کو اس زور سے دبایا کہ چوڑیاں ٹوٹ کر خون رسنے  
 لگا۔ وہ دُبدباتی آنکھوں سے پرواز کرتے جہاز کو دیکھتی رہی اور آپ ہی آپ کہتی  
 رہی۔۔۔ کیا میں بے وفا ہوں۔ کیا میں بے وفا ہوں۔۔۔!!

## خوابوں کے کھنڈر

حمید کے پیر پیڈل پر تیز تیز چلنے لگے۔ وہ پھر خوابوں کے سفر کی طرف رواں تھا۔ یہ اس کا معمول ہی تھا جب کبھی وہ رکشا پر کوئی دور کے محلے کی سواری بٹھاتا اس کے قدم پیڈل پر تیزی سے گھومنے لگتے۔ اور اس کا دماغ خوابوں کے تانے بانے میں الجھنے لگتا۔ دن کے خواب وہ ہمیشہ ہی دیکھا کرتا۔ رات کو نیند ہی کہاں آتی جو خواب دیکھ سکے۔ رات کو بارہ ایک بجے سکند شو پکچر چھوٹنے کے بعد سواری کر کے جب واپس گزرتا تو اس کا انگ انگ ٹوٹتا محسوس ہوتا۔ پسینے کی بوندیں جسم سے چپکی رہتیں۔ پیٹ اندر کی طرف دھنسا ہوا ہوتا۔ کون تھا اس گھر میں اس کا ہمدرد جو اس کے آتمہی ہاتھ منہ دھونے پانی دیتا اور گرم گرم روٹی اس کے آگے رکھتا چھوٹے سے گھر میں وہ تھا اور اس کا بیٹا وحید۔

وحید کی پیدائش پر ہی اس کی ماں نے آنکھیں بند کر لی تھیں۔ محض اس لیے کہ وہ اُسے وقت پر دوا میں اور خون کی بوتل مہیا نہ کر سکا تھا۔ بڑے ڈاکٹر صاحب نے ۸۰ روپے کی دوائیں لکھ دیں۔ اور خون دلوانے کہا۔ اس کا بس چلنا تو اپنی ایک ایک رگ کاٹ کر جمیلہ کے جسم میں اپنا خون پہنچا دیتا۔ مگر اس کا خون بھی اُسے

دھوکا دے گیا تھا۔ ٹسٹ پر پتہ چلا کہ یہ خون جمیلہ کے گروپ کا نہیں اس نے خود کو  
 کوسا، اور قبل اس کے کہ وہ جمیلہ کے گلے میں پڑی سوئے کی کالی پوت کو بکوا کر بلڈ  
 بنک سے خون لاسکے، جمیلہ بہت دور جا چکی تھی۔ اپنا سہاگ اس نے یکے نہ دیا  
 بلکہ اپنے خون جگر کو جمیلہ کی آغوش میں ڈال دیا۔ گوشت کے اس ٹکڑے کو دیکھ کر  
 حمید بلک بلک کر رو پڑا مگر جب اس نے چاندی کے کٹورے جیسی دوا نکھوں  
 کو دیکھا تو، یوں لگا، جمیلہ جاتے جاتے اپنی نظر بچے کو دے گئی۔ ہو بہو جمیلہ کا  
 عکس تھا ننھا — اس نے بڑے پیار سے اس کا نام وحید رکھا۔ ننھا وحید  
 باپ کی شفقت کے سائے میں پروان چڑھتا رہا۔ حمید ہر وقت خوابوں کی دنیا میں  
 کھویا رہتا۔ وہ دیکھتا وحید بڑا ہو گیا ہے، ڈاکٹر بن گیا ہے بہت بڑے اسپتال  
 میں ہے۔ سفید کوٹ پہنے۔ اسٹیتھسکوپ گلے میں ڈالے گھوم رہا ہے۔ اس کے  
 آگے پیچھے مریضوں کا تانتا بندھا ہوا ہے۔ اور پھر کسی کار کے ہارن یا لاری کی آواز  
 پر اس کے خواب بکھر جاتے۔ خوابوں سے اسے ہمیشہ ہی پیار رہا۔ تنگ دستی اور  
 مفلسی نے کبھی اس کے خوابوں پر دیوار نہیں ڈھائی۔ وہ بھوکا رہتا مگر خواب دیکھتا  
 اس کے پیر رکشا چلاتے چلاتے اگر جاتے لیکن وہ خواب دیکھتا۔ رات کے سائے  
 میں سردی سے اگر سنا ہوا وہ سواری کرتا مگر خواب ضرور دیکھتا۔ گویا خواب ہی زندگی ہے۔  
 وحید نے جب میٹرک کا امتحان پاس کیا تو حمید کے خوابوں کی بستی چھر سے  
 آباد ہو گئی۔ میٹرک کی دودھیا روشنی میں کھمبوں کے سہارے کھڑا ہو کر پڑھنے والا  
 وحید امتحان میں فرسٹ کلاس کامیاب ہو چکا تھا۔ اس دن حمید خوشی سے پاگل ہو  
 اٹھا۔ آسمان کے ستارے اس کے آنکھوں میں رقص کرتے نظر آئے۔ چاند اس کی  
 آغوش میں جگمگانے لگا۔ ہوائیں مبارک باد گانے لگیں۔ پھولوں نے رنگ برسایا۔  
 بادل جھومنے لگے، بجلی نے روشنی جلائی، بارش نے موتی کے قطرے لٹا دیئے۔

حمید فضا میں اڑتا رہا ..... اڑتا رہا۔۔۔۔۔

اور پھر حمید خوابوں کی دنیا سے لوٹ گیا۔

”بابا مجھے آگے پڑھنا ہے، مجھے انٹر میں داخلہ چاہیئے۔“

وحید کی آواز نے حقیقت کا پردہ چاک کیا۔

”ہاں میرے بچے، تو پڑھے گا، ضرور پڑھے گا۔ تجھے بہت بڑا ڈاکٹر بننا ہے۔“

اس نے وحید کو گلے لگا لیا۔

”بابا اتنی بڑی پڑھائی کے لیے پیسہ بھی تو چاہیئے۔“ وحید کا ننھا ذہن بھی

پیسے کی اہمیت سمجھنے لگا تھا۔

”یہ سوچنے والا تو کون ہے۔ تیرا باپ جو بیٹھا ہے۔ بس تو پڑھے جا بیٹا، یہی

تیرا کام ہے۔ میرے خواب بکھرے ہوئے ہیں انھیں سمیٹ کر تعبیر دیدے۔“

حمید کی آواز غلامیں بھٹک گئی، وہ پھر خوابوں کی سیڑھیاں طے کرنے لگا۔

وحید کو بڑی مشکل سے انٹر میں جگہ مل سکی، وہ پہروں انتظار کرتا، مگر

لسٹ میں اس کا نام نہ ملتا۔ آخر تھک ہار کر اس نے ایک پرائیویٹ کالج میں ۵۰۰

روپے کی رقم دے کر داخلہ لے لیا۔ وہ جانتا تھا کہ ماں کی آخری نشانی جوہری کے

ہاتھوں سے بچ کر بابا نے یہ رقم اس کے حوالے کی تھی۔ دو سال پلک جھپکنے میں گزر گئے

وحید انٹر بھی پاس کر چکا۔ اب حمید کے خوابوں کی تعبیر قریب آرہی تھی۔ وہ

اُڑن کھٹولے پر بیٹھا دنیا کی سیر کرتا رہا۔ انٹر کی کامیابی پر اُس نے ایک چھوٹی

موٹی تقریب کر ڈالی۔ محلے کے چند لوگ جمع ہوئے، جن خالانے کھانا بنایا۔ افضل

بھائی نے پھولوں کے ہار گوندھوائے۔ اور امام صاحب نے مٹھائی فاتحہ دلو کر بچوں

میں تقسیم کروائی۔

چھوٹا سا سفالی مکان غریبی کے قہقہوں سے گونج اٹھا۔ حیدر چاچا کی لڑکیوں

نے ڈھولک پر تھاپ دینی شروع کی تو گویا محلے میں نقارے سے بج اٹھے مگر حقیقت یہ تھی کہ نہ وسیع ہال تھے، نہ ٹیبل، نہ کرسیاں، نہ لوازمات، نہ برقی قمیے، نہ شادیا۔ مفلس کے گھر کی تقریب ہی کیا، بس اتنا ضرور ہے کہ بے بسی اور تنگ دستی کی اس دعوت میں یگانگت اور خلوص غریبی کے دستر کے لوازمات ہوتے ہیں۔

وحید یہ سب کچھ دیکھ کر خوش نہ ہو سکا۔ وہ جانتا تھا کہ اس کا باپ رات رات بھر جاگتا رہتا ہے، کھانا سنا رہتا ہے۔ یہی وہ عمر تھی جب شعور بختگی کی راہ پر گامزن ہو جاتا ہے۔ احساسات کی چادر اپنی لپیٹ میں لینے لگتی ہے خوشی کے چہرے پر غم کا نقاب ہوتا ہے۔ قہقہوں کی آواز میں سسکیوں کی بازگشت بھی ہوتی ہے۔ مسرت کی اس محفل میں کرب بھی بسیرا لیتا ہے۔ اجالوں کی اس بستی میں کہیں کہیں اندھیرے بھی چھپے رہتے ہیں۔ وحید کا ذہن جھٹک رہا تھا۔ وہ خواب نہیں دیکھ سکتا تھا۔ حقیقت اس کے آگے تھی۔ یاس ناامیدی، بے بسی، مجبوری، محرومی، نارسائی اور بیکسی اس سے کسی کانٹے دار جھاڑیوں کی طرح لپٹے ہوئے تھے۔ وہ ان سے دامن چھڑانے کی کوشش کرتا تو اس کا انگ انگ سے خون رسنے لگتا اور یہی خون آنکھوں کی راہ آنسو بن کر بہ جاتا۔ کتنے بے ضرر تھے یہ موتی۔ کوئی خریدار نہ تھا کوئی بولی لگانے والا نہ تھا۔ وقت مسکرا رہا تھا۔

..... مگر حمید نے کبھی ان باتوں کی پرواہ نہیں کی۔ وہ امیدوں کی دنیا میں جیتا، اس کے ساغر میں ڈوب رہتا، تمناؤں کے چراغ جلاتا رہتا۔ آرزوؤں کے پھول سجائے رکھتا۔ انتظار اور وقت کے ساتھ آنکھ مچولی کھیلتا۔ بوڑھی اور کمزور نگاہوں میں خوشیوں کے اُجالے تھے۔ معصوم اور تیز نگاہوں میں سہمی ہوئی حسرتوں کے اندھیرے پھیلے ہوئے تھے۔ خوابوں کے باغات کی آبیاری کرتے کرتے

حمید کاٹھوں میں الجھ کر رہ گیا۔ جب اس نے یہ سنا کہ وحید کو میڈلسن میں جگہ نہ مل سکی۔ اس کے ہاتھ شل ہو گئے۔ پاؤں زمین سے بندھ گئے۔ دل کی دھڑکنیں دھیمی ہونے لگیں۔ خوابوں کا تاج محل ریت کے گھر وندے میں ڈھلنے لگا۔

”بابا میں میڈلسن نہیں کروں گا۔۔۔۔۔“

قبل اس کے کہ وحید پوری بات کر سکتا، حمید کی انگلیوں نے اس کے گالوں پر اپنا نشان چھوڑ دیا۔

”بابا۔۔۔۔۔“

وہ بلک پڑا۔ حمید نے محسوس کیا جیسے اس کا دل چٹخ گیا ہو۔ اس نے درد سے بے تاب ہو کر وحید کو لپٹا لیا۔ وحید کے آنسو حمید کے میلے قمیص پر دائرے بناتے رہے۔

”وحید۔! میرے خوابوں کو چکنا چور نہ کر میرے بچے۔ میری تمناؤں کو یوں برباد نہ کر۔ میری آرزوؤں کو یوں دفن نہ کر۔ میری حسرتوں کا گلا چاک نہ کر۔ میری امیدوں کے سورج کو اس طرح ڈوبنے نہ دے۔ آس کی کرن کو یوں بادلوں میں نہ چھپنے دے۔ زندگی کی پچپن سالہ راتیں میں نے تیرے لیے کاٹیں۔ اپنی عمر کا ایک ایک حصہ تیرے لیے وقف کر دیا۔ خوابوں کی ادھی ہوئی سے مجھے حقیقت کی وادی میں نہ پھینک، میں بکھر جاؤں گا۔ ریزہ ریزہ ہو جاؤں گا۔“

وہ سچ مچ بلک پڑا۔ پارے کی طرح بکھر گیا۔

”میں نے جب سے ہوش سنبھالا، بابا! تمہیں مصیبت اٹھاتے دیکھا۔

محنت کرتے دیکھا، دو وقت کی رونی تمہیں بنا محنت نہ مل سکی۔ تمہاری آنکھوں کا نور ہو کر بھی میں تمہیں اُجالا نہ دے سکا۔ تم نہیں جانتے بابا! آج کل دنیا کتنی سنگ دل ہے۔ تمہارے خواب میری تعبیریں، تمہارے آنسو میری حسرتیں زمانے



کو بدل نہیں سکتیں۔ یہاں قدم قدم پر روپے چاہیے، پیسے چاہیے۔ کاغذ کے یہ ٹکڑے تمہارے خوابوں کے دشمن ہیں بابا۔“ وحید نے سچائی بیان کی۔  
 ”میں اس دشمن کو تیرے قدموں میں ڈال دوں گا۔ میری ہمت میرے حوصلے کو لٹکانے والے اس موذی کو میں کچل دوں گا، بتا کتنا روپیہ چاہیے۔“ حمید کے حوصلے جاگ پڑے۔

”میدیس میں داخلہ عطیوں کے عوض مل سکتا ہے، تم کیا دے سکو گے۔“  
 ”تو صرف بتا دے تیرا کام پڑھنا ہے۔ میرے خوابوں کو تعبیر دینا ہے، یہ نہ پوچھ کہ یہ کیسے ہوگا۔“

”تم کرا سکتے ہو انتظام، تین ہزار روپوں کا۔“

وحید کی آواز حلق میں پھنس گئی، وہ گھٹی گھٹی آواز سے بولا۔ اپنے بچے کو ڈاکٹر بنانے تمہیں تین ہزار روپے لانے ہوں گے۔ اتنی بڑی رقم دے کر ایک معمولی رکشہ اپنے بچے کو کیسے ڈاکٹر بنا سکے گا۔ تم نے ایسے خواب کیوں دیکھے، جن کی تعبیر دھوئیں کی لکیر کے سوا کچھ بھی نہیں ہے۔ بھول جاؤ بابا! ان خوابوں کو خوابوں نے فریب دیا ہے، دھوکا دیا ہے۔ یہ غریب کی کشکول میں بسنے والے نہیں انھیں بھول جاؤ۔“ وحید نے سمجھایا۔

”انتظام ہو جائے گا، ضرور ہو جائے گا۔“

حمید نے وحید کی گرفت چھوڑ دی۔ اور گھر سے نکل گیا۔

”قدرت اس کے لیے پیغام لے آئی۔ گھپ اندھیرے میں سورج کی پہلی کرن کی طرح یہ اعلان اس نے دیکھا۔“ شہر میں رکشاؤں کی ریس، جو رکشہ ان مقابلے میں اول آئے گا، اسے چار ہزار روپے انعام دیا جائے گا۔“  
 اس اعلان نے اس کی ننھی کلی پر آبِ حیات چھڑک دیا۔ وہ جی اٹھا۔

اس کے سوئے قدم جاگے۔ اس کی تھکی ہوئی آنکھیں بیدار ہوئیں۔ مقررہ تاریخ پر وہ جلسہ گاہ کی جانب اپنی رکشالے کر آگے بڑھا، بہتوں نے سمجھایا کہ اب عمر اس قابل نہیں، مقابلے میں سارے جوان شریک ہیں، اس نے صاف جواب دے دیا۔ ”جس کا عزم جواب ہے وہ کبھی بوڑھا نہیں ہوتا، جس کا حوصلہ مضبوط ہے وہ کمزور نہیں ہوتا۔ ہمت اٹل ہے، اسے کوئی روک نہیں سکتا۔“

وجید نے ہاتھ جوڑ دیے۔ وہ جانتا تھا کہ اس کا باپ اس مقابلے میں کیوں جا رہا ہے۔ اس نے التجائی، منت کی سماجت کی مگر خوابوں کا زیوانہ رک نہ سکا۔ چار مینار کی پر شکوہ عمارت کے نیچے کھڑے ہو کر اس نے ایک بار اوپر نظر اٹھائی۔ بلند بالا عمارت کے مینار اپنی اہمیت منوار ہے تھے۔ جمید نے دیکھا کہ وجید ان میناروں کو چھو رہا ہے۔ تبھی مقابلے کے آغاز کا اعلان ہوا۔ اس کے قدم پیڈل پر تیز گھومنے لگا۔ اس کا رکشا ہوا سے باتیں کر رہا تھا۔ چار مینار سے کہہ حسین ساگر تک جانا تھا۔ راستے میں ٹریفک رکی ہوئی تھی۔ سڑکوں کی دونوں جانب عوام قطاروں میں کھڑے تھے۔ تالیوں کی گونج فضا کو دہلا رہی تھی۔ نعرے لگائے جارہے تھے۔ بچے چیخ رہے تھے۔ اس کی نگاہ سڑک پر تھی دل کامیابی کی امید سے دھڑک رہا تھا۔ اس کے پیئر پیڈل پر لٹو کی طرح گھوم رہے تھے۔ وہ پسینے سے شرابور تھا۔ سانس تیز چل رہی تھی۔ آنکھیں پھڑپھڑا رہی تھیں اور اس کا ذہن خوابوں میں بھٹک رہا تھا۔ وہ دیکھ رہا تھا۔ وجید ڈاکٹر بن چکا ہے ایک عالی شان بلڈنگ کی گیٹ پر اس کا نام جلی حروف میں لکھا ہے۔ لوگ قطار در قطار اندر جا رہے ہیں۔ گیٹ پر در دی پہنے چوکیدار ٹھہرا ہے۔ وجید اس سڑک پر جھکا مریض کو دیکھ رہا ہے۔ فون پر فون آ رہے ہیں وہ ایک ہاتھ سے رسیو کر رہا ہے اور دوسرے ہاتھ سے مریض کو دیکھ رہا ہے۔ پھر جمید نے دیکھا، باولوں کی اوٹ

سے جمیدہ جھانکتی ہوئی مسکرا رہی ہے۔ اس کے ہاتھ ہینڈل پر تھم گئے۔ پیر تیزی سے چلنے لگے، فضاؤں میں چیخ و پکار تھی۔ تالیوں کی گونج تھی۔ وہ خوابوں کے سفر پر رواں تھا۔ جمیدہ بادلوں کی اوٹ سے باہر آچکی تھی، اپنے خوابوں کی تعبیر دیکھ کر وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ موتی جیسے دانت چمک اٹھے اور فضاؤں میں پھول ہی پھول بجھر گئے۔ وہ ان پھولوں کو چننے کے لیے جھک گیا۔ وہ پھول سمیٹتا رہا، سمیٹتا رہا۔ . . . . جب اس کی آنکھ کھلی تو اس نے دیکھا وہ بستر کی چادر سمیٹنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کے ہاتھ پیر پیٹوں سے جکڑے ہوئے تھے۔ اس کے انگ انگ میں شدید کرب تھا۔ اس کا جسم چھلنی ہوتا محسوس ہو رہا تھا۔ سسٹرس اس کے ہاتھوں کو پکڑے ہوئے تھے۔ وہ چلانے کی کوشش میں تھا کہ دفعتاً اس کو محسوس ہوا اس کے بازو میں کوئی نوکیلی سی چیز دھنس گئی ہے۔ اور پھر وہ خوابوں کے سمندر میں غوطے لگانے لگا۔

صبح کی پہلی کرن جب اس کے چہرے پر پڑی تو اس نے دیکھا وحید ٹیبل پر سر جھکائے بیٹھا تھا۔

”وحید —“ دہی ہوئی آواز اس کے زخمی لبوں سے نکلی۔

”بابا —“ وہ اس کے قریب جھک گیا۔

”وحید، مقابلے کا کیا ہوا —؟“ حمید ابھی دنیا میں ہی سانس

لے رہا تھا۔

”مقابلہ ہو چکا بابا . . . !“ وحید اٹھ کھڑا ہوا۔

”جینے والے کو چار ہزار مل گئے اور تمہارے حصے میں یہ آئے ہیں —“

اپنے ہاتھ میں دو بیسا کھیاں لئے وہ حمید کے روبرو کھڑا تھا۔

”نہیں —“ حمید نے اپنی پوری قوت گویائی استعمال کر لی۔ اس کے

کانوں میں سیٹیاں سی بجنے لگیں۔ اس نے زخمی ہاتھ کانوں پر رکھ لئے۔ آنکھوں آگے اندھیرا چھا گیا۔ زمین و آسمان باہم ہوتے محسوس ہوئے۔ دل کی دھڑکن تیز نبض کی رفتار بھی تیز ہو گئی۔ تب اسے یاد آیا۔ پیڈل پر تیزی سے پیر گھاتے ہوئے انجانے میں وہ نیچے کی طرف جھک گیا۔ پھر اسے یاد آیا۔ جمیلہ پھول بکھر رہی تھی اور وہ ان پھولوں کو سمیٹنے کی کوشش میں زمیں پر جھک گیا، پھر اس کے بعد اس ہاتھ اور پیروں پر سے نہ جانے کتنے رکشا کچلتے ہوئے نکل گئے وہ پھول سمیٹنے میں رہا اور نصیب میں خار آئے۔

”میں نے بار بار کہا تھا بابا خواب نہ دیکھئے۔“ یہ خواب ہمارے دشمن ہیں یہ فریب ہیں مفلسوں اور محتاجوں کی پیاسی روح کو گھائل کرنے والے پتھر ہیں۔ غریبی کے ماتھے پر خوابوں کے چاند نہیں جگمگا سکتے۔ وہاں حقیقت کے جھلس دینے والے سورج چمکتے ہیں ایک مفلس کی آنکھوں میں خواب نہیں پلتے بلکہ آنسو بہتے ہیں۔ یہی ہمارا مقدر ہے۔ ایک غریب انسان اپنی تمام تر آرزو اور تمناؤں کو سمیٹ کر سنگ مرمر کا حسین تاج محل تو نہیں بنا سکتا۔ مٹی کا ڈھیر یکجا کر کے آنسوؤں کے چراغ جلا سکتا ہے، اور حسرت کے پھول برسا سکتا ہے بد نصیبی کا کتبہ لگا سکتا ہے۔۔۔۔۔ اس بار وحید کے گال بھیک گئے۔

”چلو بابا واپس چلو۔! خوابوں کی اس دنیا سے جس نے تمہیں لوٹ لیا، تمہارے پیر چھین لیے۔۔۔۔۔“

وحید نے بیساکھیاں حمید کے بازوؤں میں لگا دی اور سہارا دے کر رکشا تک لے آیا۔ حمید بہ مشکل تمام رکشا میں بیٹھ سکا اور وحید کے پیر رکشا کے پیڈل پر تیز گھومنے لگے۔ اپنے خوابوں کی اس بھیانک تعبیر دیکھ کر حمید جیسے گونگا ہو کر رہ گیا۔

## چند اکی چاندنی

لاآجوںے پہلی بار شہر دیکھا تھا۔ اونچی اونچی عمارتیں، چوڑی چوڑی سڑکیں، کاروں کا قافلہ، لوگوں کا ہجوم اسے کچھ عجیب عجیب سا لگ رہا تھا۔ نہ ہرے بھرے کھیت تھے نہ چھوٹی موٹی پگڈنڈیاں نہ پنگھٹ نہ چوپال، گاؤں کی کوئی بات بھی نہ تھی یہاں۔

لیکن پھر بھی اُسے یہ شہر بہت اچھا لگا۔ کیوں کہ اس کا پریم اُس کے ساتھ تھا۔ شہر آتے ہی لاآجوںے سب سے پہلے جم جم کرتی چوڑیاں اور جھن جھن بجنے پازیب خریدے گاؤں میں اس کی سکھیوں اور بڑی بوڑھیوں نے بتایا تھا کہ سہاگن کے ہاتھ کھنکے ہیں اور پیر بجتے ہیں، ہونٹوں پہ لالی جھتی ہے، بندیا ماتھے پر جگمگاتی ہے، اور لال چنری گورے انگ سے لپٹی رہتی ہے۔ پریم سے بیاہ ہونے کے بعد لاآجوںے بھی یہی سنگھار اپنا لیا۔ ہر لمحہ ہر پل وہ دلہن بنی رہتی۔ شہر کے ایک چھوٹے سے محلے میں ایک چھوٹا سا مکان کرایے پر لیے وہ دونوں خوشیوں کے گہوارے میں جھول رہے تھے۔ پریم ایک فیکٹری میں ملازم تھا۔ صبح سویرے وہ جاتا اور شام چھ بجے لوٹتا، دروازے پر لاآجوںے کو سولا سنگھار کئے اپنا منتظر پاتا۔ لاآجوںے اس سنگھار کو دیکھ کر بستی کی اور دوسری عورتیں بڑا رشک کرتیں، ایک دوسرے کو کہنی

مار کر یا آنکھ کے اشارے سے بتایا کرتیں۔ دن کا اجالا ہو یا رات کی تاریکی چھم چھم کی آواز اور کھن کھن کی آواز بستی میں گونجتی ہی رہتی۔ نل سے پانی بھرنے جب وہ صبح نکلتی تو کاندھے پر گاگر ہوتی اور چھاپھم کی گونج۔ بستی کے لڑکے جیسے جیسے وہ گزرتی تالیاں پٹتے، فقرے کستے، مرد ٹھنڈی آہیں بھرتے۔ عورتیں نفرت سے گردن کو جھٹک دیتیں۔ وہ یہ محسوس کرتیں کہ لاجو کوئی چور ہے جو ان کا کچھ چھین لے جائے گی۔ مگر لاجو ان سب باتوں سے بے نیاز اپنی دنیا میں مگن تھی۔ صبح سویرے اور شام ڈھلے وہ بندیا لگانا، پان کی لالی ہونٹوں پر جمانا، چنری اور ٹھنا پازیب باندھنا اور چوڑیاں پہننا کبھی نہ بھولتی۔ پریم کو دور سے آتا دیکھتی تو اس کے گالوں میں ننھے ننھے بھنور پڑ جاتے۔ اور پریم اس بھنور میں ڈوب جاتا۔ زندگی کی ہر خوشی ان کے آنکھوں میں رقص کرتی نظر آتی۔ شادی کو ایک سال گزرا اور لاجو دو جڑواں بچوں کی ماں بن گئی۔

ونے اور وجے دونوں اس کی آنکھوں کے تارے تھے۔ دونوں ہی اپنے باپ پر گئے تھے۔ ایک ہی پالنے میں وہ دونوں کو لٹا کر لوری گاتی تو یوں لگتا جیسے بھرنے بہہ رہے ہوں۔ چڑیاں چھپا رہی ہوں۔ کوئل کوک رہی ہو۔ وقت کا سورج ابھرتا ڈوبتا رہا۔ دو بچوں کی ماں بن کر بھی وہ اپنا سنگھار نہ بھول سکتی تھی۔ ننھے بچے چوڑیوں کی کھنک اور پازیب کی چم چم کو خوب پہنچاتے تھے، دور سے ہی آواز سن کر خچل جاتے۔ اسی طرح بہاروں کے دن گزارتے رہے۔ ننھی ننھی گل کاریاں تو ملی باتوں میں بدل گئیں۔ ونے اور وجے رینگتے رینگتے اب باقاعدہ چلنے لگے۔ ماں اور بچے جب آنکھ جھولی کھیلنے لگے تو لاجو آسانی سے پکڑی جاتی۔ کبھی چم چم کبھی کھن کھن لال چنری اس کا پتہ بتا دیتی۔ پھر سب جی بھر کر ہنس پڑتے۔ جیسے خوشی کے فوارے چھوٹ گئے ہوں۔ خوشیوں کے چڑھتے سورج کو بھی آخر گہن لگ ہی گیا سیاہ

بدلی اڑ کر آئی اور لاجو کے سنگھار پر برس گئی۔ پریم فیکٹری میں ایک حادثے کے دوران بلے کے نیچے آکر ختم ہو گیا۔ لاجو کی زندگی جیسے سو گئی۔ اس کے لیے یہ حادثہ جان لیوا ہی تھا مگر ونے اور وجے کے معصوم چہروں نے اس سے وعدہ لیا کہ وہ جیے۔ وہ زندہ تو رہی مگر مردہ سے برتر۔ آنکھوں میں اُداسی۔ ماتھا ویران، کلامیاں سونی۔ قدم بے آواز۔ لال چنری کی جگہ سفید اور ٹھنی ہونٹوں کی لالی پریم کے خون کی سرخی کے ساتھ بہہ گئی۔

ایک دن دو دن تین دن گزر گئے۔ لاجو ساکت ہو کر رہ گئی۔ ونے اور وجے بوکھلاتے پھر رہے تھے۔ ان کے کانوں نے، وہ آواز نہیں سنی جس کے وہ عادی تھے۔ وہ لاجو کے قریب آتے، اُسے جی بھر کر دیکھتے اور پھر خالی خالی نظروں سے ایک دوسرے کو تنکے محلے والوں نے اُسے سمجھایا کہ بچے نادان ہیں انھیں سنبھالو۔ وہ خود تو فائدہ کر سکتی تھی اس کی بھوک اور پیاس تو پریم لے کر چلا گیا تھا مگر بچے... تب اس نے سوئی ہوئی زندگی کو جگایا۔

”ونے وجے ——— آؤ کھانا کھالو۔“

اس آواز کو سن کر وہ ماں کے قریب پہنچے۔ اسے غور سے دیکھا اور پھر ونے نے کہا۔

”تم ہماری ماں نہیں ہو۔“

”ہاں تم ہماری ماں نہیں ہو۔“ اب وجے بھی اس کے ساتھ تھا۔

”نہیں ایسا نہ کہو، میں ہی تمہاری ماں ہوں۔“

لاجو نے محسوس کیا کہ پریم سے بندھن ٹوٹنے پر بچے بھی شاید اسے اپنی ماں تسلیم نہیں کرتے۔

”چھوڑ دو ہمیں تم ہماری ماں نہیں ہو۔“ دونوں نے ایک ساتھ کہا۔

”نہیں۔۔۔۔۔ میں ہی تمہاری ماں ہوں لو کھانا کھا لو۔“

اس نے نغمہ ان کے منہ کی طرف لے جانا چاہا لیکن دونوں ہاتھ جھٹک کر اٹھ گئے۔

”ہماری ماں کی کلایاں خالی نہیں تھیں۔“ ونے نے کہا۔

”چم چم کرتی چوڑیاں بہتی تھیں وہ۔“ وجے بولا۔

”ہماری ماں کے پاؤں میں گھونگھو بجاتے تھے۔“ ونے نے کہا۔

”ہماری ماں لال چنری اور مٹھی تھی۔“ وجے بولا۔

”ہماری ماں کے ہونٹوں پر لالی پر لالی رہتی تھی۔“ ونے نے کہا۔

”اور ہماری ماں لوریاں گا کر ہمیں سلاتی تھی۔“ وجے نے کہا۔

”تم ہماری ماں نہیں ہو۔ جب ہماری ماں آئے گی تبھی ہم کھائیں گے۔“

دونوں نے کہا اور ایک کو ٹھری میں جا کر اندر سے دروازہ بند کر لیا

لاجو چیختی رہی، سمجھاتی رہی، مناتی رہی، مگر وہ مانے نہیں۔ شام ڈھل گئی۔

رات آئی، چاروں طرف سناٹا تھا۔

بچے دودن سے بھوکے تھے۔ لاجو کی منہ تڑپ اٹھی، اس نے کوٹھری کے

سوراخ سے جھانک کر دیکھا۔ دونوں بے سدھ پڑے تھے۔ اب اس سے برداشت

نہ ہو سکا۔ وہ دوسری کوٹھری میں چلی گئی۔

رات کا پھیلا پہر تھا، ہوائیں سائیں سائیں کرتی چل رہی تھی۔ فضا میں تاریکی

کے سوا کچھ نہ تھا۔ تبھی جیسے آسمان شق ہوا اور بجلی تڑپ کر باہر نکلی۔ چم چم

چم چم کی آواز نے فضا کا سکوت چھین لیا۔ لاجو کوٹھری کے دروازے پر کھڑی

ہو گئی۔ مکمل سنگھار سے آراستہ وہ ایک ایسی دلہن لگ رہی تھی جس کا دلہا ابھی

آنے کو تھا۔ اس نے دھیرے دھیرے گانا شروع کیا۔



میا کی آنکھوں کے تارے

جگ جگ جیو میرے پیارے

سپنوں کی رانی آئی

گیت سہانے لائی

دور ہوئے اندھیا رے،

جگ جگ جیو میرے پیارے

گیت ختم بھی نہ ہوا کہ بچے باہر نکل آئے اور دوڑ کر لاجو سے لیٹ گئے۔ لاجو نے محسوس کیا، پریم زندہ ہے اور ونے اور وجے کے روپ میں مٹھل گیا ہے۔ وہ دونوں کو بٹھا کر کھانا کھلاتی ہوئی گاتی رہی۔ سناٹے میں اس کی آواز بستی والوں تک پہنچ چکی جس گھر میں غم نے قدم رکھے وہاں خوشیوں کا آلاپ، کتنی بے معنی سی بات تھی۔ سبھی اپنے گھروں سے اس سکھ اور دکھ کی برکھا کو دیکھنے نکل آئے لاجو کو سولا سنگھار کئے بچوں کو بٹھائے گیت گاتے دیکھا تو جیسے بستی والوں کے سینوں میں بم کے دھماکے ہو گئے۔

”لعنت ہے ایسی عورت پر۔“ مولوی صاحب نے کہا۔  
 ”کلمہ ہی۔ جنم جلی شاید پتی کے مرنے کی راہ دیکھ رہی تھی۔“ ٹھکرائن نے کہا۔  
 ”بے چارہ مر کر دو دن بھی نہیں ہوئے اور یہ دولہن بن گئی، پاپن کہیں کی۔“  
 امام صاحب کی بیوی نے پھٹکارا۔

”رام رام کلجگ ہے بھیا ایسی عورت کا تو منہ بھی نہ دیکھنا چاہیے۔“  
 پنڈت جی نے کہا۔

”نکالو اس بد معاش کو اس محلے سے۔“ فضلو دادا نے پکار کر کہا۔  
 ”یہ بستی شریفوں کی ہے۔ ذلیلوں کا اس بستی میں کام نہیں۔“ جگو نے پکار کر کہا۔

” نکالو اسے دھکے دے کر لاجول ولاقوہ “ امام صاحب جوش میں بولے۔  
 لاجو باتوں کے یہ تازیانے چپ چاپ ہستی رہی اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ جگو  
 اور فضلواندر آئے اور اس کا سامان باہر پھینک دیا۔

” نکل جا ہماری بستی سے یہاں آوارہ اور بدچلن عورتوں کا ٹھکانہ نہیں۔ “  
 اور پھر سامان باہر پھینکا جانے لگا۔ بچے سہم کر رو پڑے۔ لاجو نے انھیں سنہیا  
 اور رات کے اندھیرے میں سب کچھ وہیں چھوڑ کر صرف ونے اور وجے کا بازو تھا  
 بستی سے دور نکل پڑی۔

ایک طرف حسن جوانی اور تنہائی تھی، دوسری طرف ہوس۔ تیز نگاہیں اور سود  
 بازی وہ کس کس سے نیٹتی۔ لاکھوں کی بھیر میں وہ تنہا تھی۔ اس نے ہمت نہ ہاری،  
 ونے اور وجے کو سینے سے لگائے آگے بڑھ گئی۔ جہاں چیونٹی کو رزق مل جاتا ہے  
 وہاں انسان کی کیا بات ہے۔ بس محنت لگن اور حوصلہ چاہیے۔ لاجو اسی کے بل  
 پر نکل پڑی تھی۔ اس نے اسلم میاں کے پاس کی نوکری کر لی۔ جو ایک  
 اسکول کے ریٹائرڈ ہیڈ ماسٹر تھے۔ ونے اور وجے کو انھوں نے اپنے دوست  
 رام دیال کی نگرانی میں دے دیا۔ اسلم خدا پرست انسان تھے اور رام دیال انسانیت  
 دونوں کی دوستی برسوں سے تھی۔ رمضان ہو یا بقرعید، دسہرہ ہو یا دیپاولی، ہر  
 عید و تہوار دونوں اسی جوش و خروش سے مناتے۔ محرم کا سوگ رام دیال کے  
 یہاں منایا جاتا اور ہولی کی بہار اسلم میاں کے پاس ملتی۔ اس گنگا جمنی ماحول میں  
 ونے اور وجے پر کندن کا رنگ چھا گیا۔ برہمتی ہوئی عمر نے اچھی باتیں سیکھ لیں۔  
 مذہب سے لے کر انسانیت تک کے ہر مکتب کی تعلیم سے وہ آراستہ ہو کر نکھر گئے  
 کبھی کبھار لاجو بیتی ہوئی باتوں کو یاد کر کے جب چپ سی ہو جاتی تو ونے اور  
 وجے اپنی ماں کی آغوش میں پڑ جاتے۔

”ماں تیرا چہرہ گدلا گدلا سا کیوں ہے۔“

”میں نے نمکین پانی سے چہرہ دھویا ہے نا اس لیے۔“

وہ انھیں بتاتی۔ بچے نا سمجھ نہیں تھے۔ خوب جاننے لگے تھے۔ تب وہ

جواب دیتے۔

”ہم دونوں کے ہوتے تو نمکین پانی سے کیوں منہ دھوتی ہے۔ ماں ہم تیرے لیے چاندنی جیسا دودھیا پانی لے آئیں گے تو اس سے نہا کر چندا جیسی ہو جائے گی اور لاٹو انھیں سینے سے لگا کر اپنے سرخ ہونٹوں سے وہی گیت دہرائے لگتی۔

اتنے بڑے ہو کر بھی ونے اور وجے ماں کی چوڑیاں اور پازیب کا خیال برابر رکھتے تھے۔ ”ماں تو سنگیت کی دیوی ہے۔ تو اگر ساز نہ بجائے گی تو مندر کی گھنٹیوں اور مسجد کی اذانوں میں زندگی نہ رہے گی۔ تیری سرگم کے تانوں پر ہمارے قدم رقص کرتے ہیں ماں۔“

اور لاٹو کے دھیرے دھیرے چلتے قدم تیز تیز ہو جاتے۔ فضاؤں میں گھونگھروں کی بازگشت ہونے لگتی۔ وقت کا پہلیہ گھومتا رہا۔ لاٹو اس ضعیفی میں بھی سولا سنگھار کئے رہتی۔ پہلے وہ پریم کی راہ نکلتی تھی، اپنی آنکھوں میں پیار کی جوت جگائے اور اب بچوں کی راہ دیکھتی ہے۔ اپنے ہونٹوں پر ممتا کے گیت سجائے۔ وہ خود کو سدا سہاگن سمجھتی۔ اس کی چوڑیوں میں ونے کا دل تھا اور اس کی پازیب میں وجے کا دل۔ وہ ان دونوں کی نگہبان تھی کہیں ہلکی سی تھیس بھی نہ پہونچے اور وہ ٹوٹ نہ جائے۔ زندگی کی ڈور دراز ہوتی گئی۔ پھر شہر میں ایک قیامت آگئی۔ حشر برپا ہوا فساد پھوٹ پڑا۔ چیخ و پکار آہ و زاری بچاؤ کی صدائیں گونجنے لگیں۔ آگ کے شعلے بھڑک اٹھے۔ عمارتیں جلتی رہیں۔ تہذیب و تمدن کو آگ لگ گئی۔ مندر ٹوٹ گئے۔ مسجدیں ڈھادی گئیں۔ پنڈت قتل ہوئے، امام کچلوا دیئے گئے۔

صدیوں کا میل ملاپ، بھائی چارگی اخوت سب کچھ پلک جھپکتے میں نفرت میں بدل گئے، لمبوں پر جہر و وفا کے بدلے گالیاں تھیں۔ ہاتھوں میں دوستی کے پُر غلوں جام نہیں بلکہ دشمنی کے زہر بھرے پیالے تھے۔ آنکھوں میں مروت کی جگہ بیگانگی تھی۔ دلوں میں صداقت کی جگہ عداوت تھی۔ بستیاں اجڑ گئیں، لوگ پناہ گاہیں ڈھونڈنے لگے۔ ونے اور وجے نے اپنے گھر میں تمام مسلمانوں کو پناہ دی۔ اپنے دروازے کے آگے وہ سینہ تان کر کھڑے ہو گئے۔ لاجو نے نوجوان لڑکیوں کو اپنے آپٹل میں چھپا لیا۔ ونے اور وجے نے چھاتی تان کر بوڑھوں کو بیٹھ بیٹھے چھپا لیا۔ امام صاحب ان کی بیوی، فضلو، مولوی صاحب اور بستی کے نہ جانے وہ کون کون لوگ تھے۔ جو لاجو کے گھر پناہ لے رہے تھے۔ سب نے اسے پہچان لیا۔ چوں کہ لاجو بوڑھی ہو کر بھی سہاگن تھی۔ وہ سوچ رہی تھی کہ کہیں یہ لوگ اس کی پناہ سے نکل نہ جائیں اور باہر جا کر کاٹ نہ دیے جائیں کیوں کہ کبھی انھوں نے اسے بستی سے نکالا تھا۔ بد معاش اور ذلیل کا خطاب دیا تھا۔ اس نے صاف صاف کہا۔

”پتہ نہیں تم لوگوں نے مجھے یاد رکھا یا نہیں پر میں تمہیں بھلا نہیں سکوں گی۔ کیوں کہ تم اس بستی کے رہنے والے ہو جہاں میرا پریم رہا کرتا تھا میں بد معاش آوارہ اور ذلیل سہی مگر یہ وقت ایسا ہے کہ تمہیں میرے یہاں پناہ یعنی پڑے گی۔ میں اپنے بچوں کی قسم کھا کر کہتی ہوں، یہاں تمہیں کوئی تکلیف نہ ہوگی۔ میرے بچے تمہاری حفاظت کریں گے۔ جھگوان کے لیے بس رُکے رہو، جب یہ طوفان تھم جائے گا تب چلے جانا۔“

لاجو کہہ رہی تھی، تبھی فضا میں گریں کی آواز شروع ہو گئی۔ پولیس نے فائرنگ شروع کر دی تھی۔ آہ و بکا کا طوفان مچ گیا۔ لاجو بے اختیار باہر نکلا۔ پڑی دروازے کی دہلیز پر ہی کسی چیز سے ٹھوکر کھا کر گر گئی۔ چوڑیاں ٹوٹ کر ادھر ادھر

بکھر گئیں۔ پازیب کھل کر گھونگھرو پھیل گئے۔ ایک انجانا سا خوف اس کے دل میں پیدا ہوا۔ نظر اٹھا کر دیکھا تو دروازے کے پاس ہی اس کے دل کے دو ٹکڑے خون میں لہو لہان پڑے تھے۔

”ونے — — وجئے — —“ مگر مردہ جسم حرکت نہ کر سکے۔ گولی سینے کے آر پار ہو چکی تھی۔ وجئے اور ونے دونوں نے انسانیت پر وجئے پالی تھی۔ وہ مکر بھی امر تھے۔ اور لاجو بکھری ہوئی چوڑیوں اور بکھرے ہوئے گھونگھروں کو سمیٹ رہی تھی

اس دن کے بعد سے لاجو بستی کے اس پاس سفید چادر اور مٹھے گھومتی نظر آتی۔ اس کے سر کے بال ایک دم دودھ جیسے اُچلے ہو گئے تھے وہ ہر آنے جانے والے کا راستہ روکتی اور کہتی۔

”دیکھو تو ونے اور وجئے نے مجھے چندا کی چاندنی بنا دیا۔ میں چندا کی چاندنی ہوں۔“ وہ کھل کھلا کر ہنس دیتی، اگرچہ کہ اس کی آنکھوں کے گوشے نم ناک ہو جاتے۔

## دل ایک سجدہ گاہ

”نہیں نہیں۔۔۔۔۔ میں نے کہہ دیا نا ایسا نہیں ہو سکتا۔“ نگار کے لہجے میں غصہ تھا۔  
 ”لیکن مہی ! میری خوشیوں کا کیا ہوگا۔۔۔“ ثمر نے اُمید کا دیا بھتے دیکھ کر پوچھا  
 ”خوشیاں۔۔۔۔۔ کیا خوشیاں اسی منزل پر جا ٹھیرتی ہیں جیسے تم اپنا ہے ہو۔“  
 نگار نے سوال کیا۔

”میں شکیا کے بغیر جینے کا تصور نہیں کر سکتا۔“ وہ آبدیدہ ہو رہا تھا۔  
 ”سمجھ میں نہیں آتا کہ تم جیسا ڈاکٹر بھی ایسے جنون کا شکار کیسے ہو گیا۔“ نگار کے لہجے  
 میں طنز تھا۔

”مہی۔ کیا ڈاکٹر انسان نہیں ہوتے۔ ان کے دل میں کوئی جذبات نہیں ہوتے۔ مہی  
 پلیز اتنی سنگ دل نہ بنیے۔“ ثمر نے نگار کے ہاتھ تھام لیے۔  
 ”بے کار بحث میں الجھ کر زندگی کے انمول لمحے برباد نہ کرو۔ میرا بھی تم پر کچھ فرض ہے۔“  
 نگار نے جواب دیا۔

”بہ شک آپ میرے جسم کا ہر عضو لے لیں، میری رگوں میں دوڑتا ہوا سارا خون  
 لے لیں، اگر ایک خوشی ہرقے میں دیدیں۔“ ثمر کسی سچے عاشق کی طرح نگار کے زانوں پر

جھٹ گیا۔

”مجھے دکھ ہو رہا ہے کہ میں ایک نامور ڈاکٹر کی ماں نہیں بلکہ ایک کمزور عاشق کی ماں ہوں۔ اٹھو ٹھہریہ وقت ایسی سطحی باتوں میں گنوانے کا نہیں ہے۔ شہیا میں کوئی بیکر نہیں جڑے ہیں، تمہیں کوئی بھی لڑکی مل سکتی ہے۔ اپنے نظر کو محدود اور اپنے دل کو مجبور نہ ہونے دو۔ جاؤ اور وہ شمع روشن کرو جس کی لو دنیا کو اجالا دکھائے۔“ اور وہ اٹھ کھڑی ہو گئی۔ ثمر مجبور ہو گیا۔

”شہیا۔ مٹی انکار کر رہی ہیں۔“ ثمر نے کہا۔

”اور تمہارے وعدے۔“ شہیا نے یاد دلایا۔

”مجھے الزام نہ دو۔ میری مجبوری کو سمجھو۔“

”تو کیا تمہارے پیار کو فریب جانوں؟“ شہیا بولی۔

”اپنے دل سے پوچھو۔!!“

”میرا دل تو تمہارے قدموں میں پڑا ہے یہ اور بات ہے کہ تم اسے بڑھ کر اٹھا

نہیں سکتے۔“

”میں خود بھکاری بنا، مٹی کے آگے کشکول لیے کھڑا ہوں۔“

”ماں تو موم کی گڑیا ہوتی ہے اولاد کی ہر خواہش پر وہ بچھل جاتی ہے، لیکن تمہاری

مٹی وہ ..... وہ اتنی بے دردیوں ہیں۔“ شہیا نے پوچھا۔

”نا۔ انہیں ایسا نہ کہو وہ تو میرے لیے سایہ ابر میں زندگی کی اس کڑی دھوپ میں“

”تو پھر تمہاری اس خوشی کی مخالف کیوں ہیں۔“

”پتہ نہیں۔ میں خود حیران ہوں کہ انہیں تمہارے نام سے اتنی دُوری کیوں

ہے، حالانکہ انہوں نے کئی بار تمہیں دیکھا لیکن وہ تمہیں بہو کے ناطے قبول کرنا نہیں چاہتیں“

شبیبا جذبات میں ڈوب کر بولی۔

”واہیات۔۔ بکواس۔ مجھے افسوس ہے کہ تم ایک ڈاکٹر ہو کر بھی دل کے بارے میں ایسے خیالات رکھتی ہو۔“

”ڈیڈی! آپ نے دل کو بس انسان کے جسم کا ایک حصہ سمجھا، شاید اسی لیے ایسا سوچا۔“

”میں نے محبت جیسی بے کار اور لغو شے کو اپنے ذہن اور عقل کی دکشتری سے نکال دیا ہے یہ ان لوگوں کا کام ہے جنہیں دنیا میں بے مصرف بھیجا گیا ہو۔ یہ اور بات ہے کہ میں تمہیں بے پناہ چاہت کے سبب ہر قسم کی آزادی دے دیتا ہوں۔ ورنہ میرے اصول اور میرے مزاج کے خلاف میں نے کوئی کام نہیں کیا۔ نہ جانے وہ کونسا جذبہ ہے جو مجھے تمہارے آگے مجبور کر دیتا ہے۔“ ڈاکٹر الیاس نے سمجھایا۔

”اسی لئے تو مجھے ناز ہے آپ پر۔ پتہ نہیں شمر کی مٹی کی بنی ہو اپنے بیٹے کی خوشی پر راضی نہیں۔“

”ہو سکتا ہے ان کے اپنے اصول بھی ہوں۔ اس کے کچھ تقاضے بھی ہوں اور وہ اپنے اصولوں کو اولاد کی محبت میں قربان کرنے کے خلاف ہوں۔“

”لیکن ڈیڈی، محبت کوئی جرم تو نہیں، پیار کوئی خطا تو نہیں، سچ پوچھیے تو اس کائنات کی بنیاد ہی محبت ہے۔“ شبیبا جیسے گہرائی میں ڈوب گئی۔

”نان سنس، کائنات کے وجود کا محبت سے کیا تعلق ہے۔؟ یہ دراصل بیماری ہے جو آغاز جوانی سے لگ جاتی ہے۔ شاید یہ پتہ نہیں کہ ہم نے کیسے کیسے مرحلے پر خود کو بچالیا۔ ہماری زندگی میں بھی ایک ایسا وقت آیا تھا جب کہ کسی نے آنچل پھیل کر ہم سے سودا کرنا چاہا۔ پیار کے بدلے پیار مانگا لیکن ہم جوان باتوں کے خلاف ہیں اس آنچل کو جھٹک کر نکل گئے۔ پیار لیا اور نہ پیار دیا۔ شادی کو زندگی کی



”شاید میرے نصیب میں تمہارا ساتھ نہیں لیکن ثمر۔ یہ دل جو تمہارے لیے دھڑکتا ہے تمہارے بغیر اپنی دھڑکن بھول جائے گا۔ یہ آنکھیں جو کائنات میں صرف تمہیں کو دیکھتی ہیں تمہارے بغیر بے نور ہو جائیں گی۔ یہ پیکر جو صرف اور صرف تمہارے لئے زندہ ہے تمہارے بغیر مٹی کا ڈھیر بن جائے گا۔“ شیا کی آواز شدت جذبات سے مغلوب ہو گئی۔

”ایسا نہ کہو شیا۔ تم ہی تو میرا عنوان حیات ہو۔ تمہارے بغیر میں کیا ہوں۔ ایک بے نام سی شے۔“ ثمر نے اس کے بہتے آنسوؤں کو اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔

”تو کیا ہم کبھی ایک دوسرے کے نہ ہو سکیں گے۔“

”حوصلہ اور عزم مایوسی اور ناامیدی کی دنیا کے چاند اور سورج ہیں۔ بس انہیں کے اُجالے کو اپنالو“ ثمر نے ہمت بندھائی۔ شیا کی تیز سسکیاں آہستہ آہستہ تھمنے لگیں۔

”ڈیڈی۔ ثمر کی مٹی انکار کر رہی ہیں۔“ شیا اپنے باپ سے مخاطب تھی۔

”انکار۔ اور تمہارے لئے۔“ ڈاکٹر الیاس حیران رہ گئے۔

”ہاں۔ اور میں ثمر کے بغیر نہیں رہ سکتی ڈیڈی۔“ شیا پھر بھوٹ گئی۔

”نہیں بیٹی، میرے سامنے اپنے آنسوؤں کو نہ بہنے دو۔ تم نہیں جانتیں کہ تمہارے پسینے کی ایک ایک بوند میں نے موتیوں سے تولی ہے۔“ ڈاکٹر الیاس نے کہا۔

”لیکن ڈیڈی اب شاید آنسو ہی میا مقدر ہیں۔“

”میرے جیتے جی یہ نہیں ہو سکتا۔ لیکن میری سمجھ میں یہ نہیں آیا کہ ثمر میں ایسا کیا بات ہے جو تم اسی کے لئے باولی ہوئی جا رہی ہو۔“

”ڈیڈی ثمر میرے دل کا مکین بن گیا ہے۔ وہ کیسے دبے پاؤں میرے دل میں داخل ہو گیا مجھے کچھ یاد نہیں مگر اب یہ بات ہے کہ وہ دل ایک مندر بن گیا اور میں پجاری بن۔“

دل تو ہو مگر دھڑکن نہ ہو“ شبیا کی یہ باتیں کسی فلسفے سے کم نہ تھیں۔ ڈاکٹر الیاس نے بھی محسوس کیا کہ وہ سب کچھ رکھتے ہوئے بھی جیسے خالی خالی سے ہوں۔ یکبارگی ان کے دل نے دھڑک کر اس لمحہ کو یاد کیا جب وہ جوان تھے۔ اور کسی حسین لڑکی کے معصوم اور محبت سے سرشار دل کو اپنی ٹھوکر کا نشانہ بنایا تھا۔ اسی لمحہ انہوں نے کوئی کسک اپنے دل میں محسوس کی شاید یہ اسی کی یاد تھی۔

”گھبراؤ نہیں شبیا۔ ہم تمہارے لئے شرم کی مٹی سے بھی مل ہی لیں گے۔“ انہوں نے آخر کار مان لیا۔

”سچ ڈیڈی۔“ شبیا ان سے پیٹ گئی۔

”آئیے ڈاکٹر صاحب، اندر تشریف لے آئیے۔“ ثمر نے ڈاکٹر الیاس کو اپنے دروازے پر پایا تو کہہ اٹھا۔

”تمہاری مٹی تو ہیں نا!“ انہوں نے کہا

”جی ہاں۔“ اور وہ اندر آگئے۔ بید کے بنے صوفے پر بیٹھ کر انہوں نے پائپ سلگایا اور ماحول دھویں میں جیسے ڈوب گیا۔

”آئیے مٹی۔“ ثمر نے پردہ ہٹایا۔ نگار کمرے میں داخل ہوئی۔ ایک لمحے کے لئے ڈاکٹر الیاس اور نگار کی آنکھیں ملیں اور دونوں ایک ساتھ گویا ہوئے۔

”تم۔۔۔۔۔“ پھر جیسے اس آواز کی بازگشت ہونے لگی۔ چند ثانیے ایسے ہی گذر گئے۔

”تشریف رکھئے۔“ نگار نے الیاس سے کہا جو اسے دیکھ کر اٹھ کھڑے ہوئے تھے

”آپ شرم کی ماں ہیں۔“ الیاس نے حیرانی سے پوچھا۔

”آپ کو کچھ شک ہے۔“ نگار نے جواب دیا۔

ضرورت سمجھا۔ تمہاری ماں بیاہ کر آئیں، تمہاری پیدائش کے بعد جب وہ گذر گئیں، تب ہمیں ان کی جدائی کا احساس محض اس لئے ہوا کہ ہم اپنی ضرورتوں کے لئے اوروں کے محتاج ہو گئے۔ ورنہ تمہاری ماں نے ہمیں ہر آرام بہم پہنچایا تھا۔ اب رہی جدائی یا بھڑکی بات تو ہم اس کے قائل نہیں۔ جس عورت کو ہم نے ٹھکرایا تھا وہ بہت ہی دل برداشتہ ہو کر ہم سے دور چلی گئی۔ ہم نے اطمینان کی سانس لی اور کبھی اپنے دل میں کسی قسم کی کوئی کسک محسوس نہیں کی۔ ڈاکٹر الیاس نے شیا کے آگے ماضی کے اوراق الٹ دیئے۔

”ڈیڈی ہیں آپ بھول رہے ہیں، شاید اسی بد نصیب عورت کی آپ ہیں گئی جس نے مجھے ماں سے محروم کیا اور اب میری زندگی کا سب سے بڑا سکھ بھی دکھ میں بدل رہا ہے۔“ شیا کہیں دور جا کر کہہ رہی تھی۔

”ایک ڈاکٹر کے لئے ایسی تو ہم پرستی اس کی سنہرے داغ ہے۔ بھلا آپ کس ٹھوس حقیقت کی نشان دہی کرتی ہیں؟“ ڈاکٹر الیاس نے سوال کیا۔

”ڈیڈی ہر بات کو مادیت سے تعبیر مت کیجئے۔ انسان کے جسم میں روح نام کی بھی کوئی شے ہوتی ہے یہ اسی کا ایک حصہ ہیں۔! سوچئے آپ چاند کو دیکھتے ہیں اس کی چاندنی کو محسوس نہیں کر پاتے تو یہ آپ کی زندگی میں کتنی بڑی کمی ہے۔! پھول کو دیکھتے ہیں اس کی خوشبو سے سرشار نہیں ہو پاتے، شفق کو دیکھتے ہیں مگر اس کے رنگ میں ڈوب نہیں جاتے۔ بادلوں کو دیکھتے ہیں اور ان کی مست خرامی کو سمجھ نہیں پاتے۔ بجلی کو دیکھتے ہیں اس کی تڑپ کا اندازہ نہیں لگا سکتے۔ تاریکی کو دیکھتے ہیں اور کوئی خوف محسوس نہیں کر پاتے۔ اُجالے کو دیکھتے ہیں اور کوئی خوشی محسوس نہیں کر پاتے۔ ستاروں کو دیکھتے ہیں اور ان کی ضیا سے پر نور نہیں ہو پاتے۔ سوچئے کتنی بڑی محرومی ہے۔ گویا جسم تو ہو پر جان نہ ہو، آنکھ تو ہو پر نور نہ ہو،

”میں اگر غلطی پر نہیں ہوں تو پھر یہ سمجھ لوں کہ تم نگار ہو۔“

”تمہارا حافظہ تیز ہے۔ ماشاء اللہ نظر بھی تیز پائی۔ بیک وقت نام اور شکل کے یاد رہتی ہے۔“ نگار کا لہجہ طنز آمیز تھا۔

”عجیب اتفاق ہے۔۔۔“ الیاس نے صوفے کی پشت پر سر ٹیک کر کہا۔

”اسی کا نام ہی زندگی ہے۔“ نگار بولی

”سمجھ میں نہیں آتا کہ بات کہاں سے شروع کر دوں۔“ الیاس نے کہا۔

”شاید آپ شیبا اور ثمر کے بارے میں کچھ پوچھنے آئے ہیں تو میں پہلے ہی ثمر سے کہہ چکی ہوں۔ مزید وقت برباد کرنا مجھے اچھا نہیں لگتا ہے۔ مجھے اور بھی بہت سے کام ہیں، بے کار باتوں میں وقت ضائع کرنا میرے اصولوں کے خلاف ہے۔“ نگار کے لہجے میں بے مروتی تھی۔

”تم تو ایسے مل رہی ہو جیسے میں کوئی اجنبی ہوں۔“ الیاس نے کہا۔

”اجنبی نہیں تو شناسا بھی نہیں۔“ نگار نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

”واہ تم تو بھول ہی گئیں۔“ الیاس نے کہا۔

”یاد کسے رکھوں۔؟“

”مجھے نہ سہی اس وقت کو تو یاد کر سکتی ہونا، جب میں نے تمہارے پوچھا کے پھول قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا۔“ الیاس مطلب پر آچکے تھے۔

”اوہ۔۔۔ تو آپ مجھے صرف یہی یاد دلانے آگئے تھے۔“

”نہیں نہیں۔ میں تو اپنی بچی کی خوشی کے لئے تمہارے پاس چلا آیا۔ سنا ہے تم نے اس کے لئے درِ دل بند کر رکھا ہے۔!“

”ٹھیک سنا آپ نے، میں کوئی بھی فیصلہ دل سے نہیں عقل سے کرتی ہوں۔“  
دل جیسی بے کار شے کا میرے نزدیک کوئی مقام نہیں۔

”میرے کہے ہوئے جملے دہرا کر مجھے شرمندہ کر رہی ہو، گویا میرا تازیانہ بُھی پر ایساں نے کہا۔

”خوب سمجھا آپ نے۔“ نگار اب بھی سپاٹ سی تھی۔

”چھوڑو ان باتوں کو۔ داستان پارینہ کا اس محفل میں کیا ذکر۔ بس اتنا کہہ دو کہ تم نے شیبا کو ثمر کے لئے قبول کر لیا۔“

”کیوں۔ کیا یہ ضروری ہے۔ مجھے شیبا سے انکار نہیں لفظ محبت سے انکار ہے۔ میں ایسے لغویات کو جذبات کا سطحی پن سمجھتی ہوں۔ ایک ڈاکٹر ہونے کے ناطے میں ثمر کا وقت ایسے بکواس کاموں میں گنوانا نہیں پسند کرتی۔ مجھے محبت سے نفرت ہے اور محبت کرنے والوں سے بھی۔“ نگار اب کچھ تیز ہو گئی تھی۔

”یہ تم کہہ رہی ہو جس کے نزدیک محبت زندگی کی سب سے بڑی ضرورت تھی۔“ ایساں نے حیرانی سے سوال کیا۔

”وہ وقت اور تھا، اور یہ وقت اور ہے۔“ نگار نے جواب دیا۔

”مگر ہم نے تو سنا تھا کہ محبت کرنے والے دل بڑے حساس ہوتے ہیں۔ دوسروں کے درد کو خوب سمجھتے ہیں۔“ ایساں نے کہا۔

”ہوگا۔ مگر میں ان بے کار باتوں میں دھیان دینا پسند نہیں کرتی۔“

”نگار۔ اب مذاق چھوڑو، اور کہہ دو کہ شیبا تمہاری ہے۔“ ایساں نے دوسرا راستہ اختیار کیا۔

”مسٹر ایساں، مذاق تو آپ نے کیا تھا میرے ساتھ۔ یاد کیجئے وہ وقت جب آپ نے اپنی انا اور اپنے اصولوں کے آگے میرے پیار کو ٹھکرا دیا تھا۔ میرے آنسوؤں کی پرواہ نہ کی تھی۔ مجھے دھتکار دیا تھا۔ یہ بھی نہ سوچا کہ اُننگوں اور حسرتوں سے لبریز دل کا یہ پیمانہ انکار کے پتھر سے چکنا چور ہو جائے گا۔ محبت کو ہوس گندگی اور

نہ جانے کیا کیا سمجھنے والے آج اسی محبت کی خاطر میرے آگے ہاتھ پसारے کھڑے  
کیوں ہو گئے۔ ” نگار اُبل پڑی۔

”بس کرو نگار، وہ بھول تھی۔ مجھے معاف کر دو مگر میرا بدلہ میری بچی سے تو  
نہ لو۔ اولاد کی خوشی سب سے بڑی خوشی ہوتی ہے۔ آج میں اپنی بچی کے لئے تم سے  
تمہاری محبت مانگ رہا ہوں۔ خدا را مجھے دید و ور نہ میری معصوم بچی سسک سسک  
کر مر جائے گی۔“ الیاس نے اپنی زیادتیوں کو محسوس کر کے کہا۔

”معاف کیجئے گا۔ محبت کوئی بکنے والی شے نہیں کہ آپ جب چاہیں قیمت  
دے کر اسے خرید لیں۔ یہ سیپ میں بند وہ موقی ہے جو ہر غوط زن کے ہاتھ نہیں  
آتا۔ میرا دل اب ایسے جذبات سے خالی ہو چکا ہے۔ آپ نے جو سبق مجھے پڑھایا  
میں آج بھی اسی کے نقش قدم پر چل رہی ہوں۔ آپ کی منت سماجت میرے دل  
میں کوئی رحم کا جذبہ پیدا نہیں کر سکتے۔“ نگار نے بڑی بیزاری سے کہا۔

”نگار۔ تم بدلے کی آگ میں جل رہی ہو اس کے لئے میری بچی کو الاؤ میں  
نہ ڈالو۔ چاہو تو مجھ سے بدلہ لے سکتی ہو، مگر اس کی معصومیت پر ترس کھاؤ۔“  
الیاس نے ہاتھ جوڑ دیئے۔

”الیاس صاحب، میں کوئی بُت نہیں ہوں کہ ہاتھ جوڑ کر مجھ سے کچھ مانگا  
جائے۔ آپ کی یہ التجا خالی جائے گی، آپ جاسکتے ہیں۔“ اور نگار کرسی چھوڑ کر  
خود ہی اندر چلی گئی۔ الیاس کچھ دیر تو بیٹھ رہے پھر کسی ہارے ہوئے جواری کی طرح  
دروازے سے نکل گئے۔

اگلی صبح الیاس کے گھر پر کسی نے دستک دی۔ دروازہ کھولا گیا تو نگار ثمر کو  
ساتھ لئے کھڑی تھی۔

”تم۔“ الیاس نے حیرانی سے پوچھا۔

”ہاں میں۔“ اور وہ اندر چلی آئی۔

”اتنی صبح اور بلا علم و اطلاع کیسے چلی آئیں۔ الیاس نے پوچھا۔

”اپنی بہو کے پاس مجھے اطلاع دے کر آنا چاہیے۔!“

”بہو۔ میں سمجھا نہیں۔“ الیاس نے سوال کیا۔

”یہ لیجئے۔ یہ انگوٹھی شنبیا کو پہنا دیجئے۔ کل میں اسے دینا بھول گئی تھی۔“

نگار نے پرس کھول کر ایک ڈبیا نکالی اور الیاس کے حوالے کی۔ الیاس منہ کھولے اسے دیکھتے رہے۔

”میں حیران ہوں، کل کا انکار آج اقرار میں کیسے بدل گیا۔“ انھوں نے پوچھا۔

”کاش آپ نے سمجھنے کی کوشش کی ہوتی۔ ڈاکٹر صاحب! نشتر اور چھری سے کھیلے کھیلے آپ یہ بھول گئے کہ آپ صرف ڈاکٹر ہی نہیں بلکہ ایک انسان بھی ہیں گوشت کا وہ ٹکڑا جو سینے کے حصار میں بند رہتا ہے اسے آپ دل کا نام دیتے ہیں اور ہم اس کو سجدہ گاہ کہتے ہیں کیونکہ یہی تو وہ مقام ہے جہاں محبوب کو بٹھا کر اس کی پرستش کی جاتی ہے۔ آپ نے پیار کو فریب، محبت کو دھوکا، چاہت کو ڈھونگ سمجھا۔ کاش آپ جان سکتے کہ دل کی دھڑکن صرف محبت کے لئے مخصوص ہوتی ہے۔ پیار کا پودا ہر دل میں پھلتا چھوٹتا ہے، یہ اور بات ہے کہ کوئی اس کے سائے میں پناہ لیتا ہے اور کوئی اسے اکھاڑ پھینکتا ہے۔ تم نے یہ سمجھ لیا کہ میں اب تم سے نفرت کرنے لگی ہوں، اور بدلے کی آگ میں تمہاری بجی کو لے لیا ہے۔ کاش تم جان سکتے کہ یہ دل جسے تم نے بے دردی سے ٹھوکر لگائی، آج بھی تمہاری عبادت کرتا ہے۔“ نگار چپ سی ہو گئی۔

”نگار۔ تم نے ایک پتھر کو صنم بنا لیا مگر نتیجہ کیا ہوا۔ تمہارے حصے میں

تڑپ ہی آئی۔ مجھے معاف کر دینا، میں سچ چرچ آج دنیا کا سب سے بڑا مفلس ہوں،

جس کے پاس دل نام کی کوئی شے نہیں کوئی سجدہ گاہ نہیں۔ اور یشیانی کے دو انسو ایلیاس کی آنکھوں سے ڈھلک گئے۔

”خدارا میری عبادت گاہ کو نہ ڈھائیے، بڑے جتن سے اسے سنوارا ہے میں آپ کی اطلاع کے لئے کہہ دوں کہ ثمر میرا بیٹا نہیں اسے میں نے گود لیا ہے۔ نگار نے کہا۔“ اور تم نے کسے شریک زندگی بنایا“ ایلیاس نے سوال کیا۔ وہ ہنس پڑی۔

”جس کی زندگی محبت ہو اور جو محبت ہی کو عبادت بنا لے، اُسے شریک زندگی کی کیا ضرورت ہوتی ہے۔“ نگار کے اس جملے پر ایلیاس کے دل میں جیسے کوئی تازہ زخم ابھر آیا، اور ایک سرد آہ اس کے لبوں سے نکل گئی۔ گویا آج وہ ایک ڈاکٹر نہیں ایک انسان تھا، گوشت و پوست کا پیکر جس میں رُوح نام کی کوئی شے ہوتی ہے جو دل کی دھڑکن کو محسوس کر سکتا ہے۔



## پلکوں کی چھاؤں میں

وہ سکون کا متلاشی تھا! اس کا دل مضطرب تھا۔ اس کی رُوح بے چین تھی۔  
 دن کے ہنگامے اور رات کے سناٹے دونوں ہی اس کے غم کا مداوا نہ بن سکے، ہر لمحہ  
 وہ یہ محسوس کرتا کہ جیسے وہ صلیب پر لٹکا ہوا ہے، جیسے اس کی گردن پر تلوار رکھ دی  
 گئی ہو۔ جیسے اس کی کنپٹی پر پستول کی نالی لگی ہو۔ ایک انجانا خوف اس کے اطراف  
 ہالہ کیسے ہوئے تھا۔ وہ راہِ زیست کا تنہا مسافر تھا، اس نے شادی نہیں کی۔ وہ  
 جانتا تھا کہ وہ دل کا مریض ہے اس کا آپریشن ہو چکا ہے۔ کب سانس کی ڈور ٹوٹے  
 کب دل کی دھڑکن رُکے۔ کب خون منجمد ہو جائے۔ کب اُجالے کو اندھیرا اپنی لپیٹ  
 میں لے لے۔ کب چاند بادلوں میں چھپ جائے۔ کب آئینہ دھندلا جائے۔ کب امڑتے  
 بادل برس جائیں۔ کب وہ زندگی سے ہار مان لے۔ کب موت اسے اپنی آغوش میں لے  
 لے۔ یہی اندیشے اس کے دماغ پر مسلط رہتے۔ وہ موت اور زندگی کے بیچ لٹکا رہا۔  
 یہی وجہ تھی کہ اس نے کسی کو اپنا شریکِ زندگی نہ بنایا۔ اپنا ہم سفر اپنا رفیق نہ بنایا۔ وہ  
 نہ چاہتا تھا کہ کوئی پل بھر خوشیاں پا کر غموں کے ساگر میں ڈوب جائے۔ افشاں سے  
 جگمگاتی ہوئی مانگ اُجڑ جائے، زندگی کی آرزو کیسے نہیں ہوتی۔ وہ بھی گلشنِ زیست

کی رنگینیاں چاہتا تھا۔ مگر حالات نے اس سے سمجھوتہ نہیں کیا۔ اس کا باپ اس کے لئے لاکھوں کی دولت چھوڑ کر مرا تھا۔ مگر دل کے جان لیوا مرض نے اتنی دولت ضائع کر، اس کا سکون چھین لیا۔ وہ صبح کی پہلی کرن کو دیکھتا تو اس کے لبوں سے ہر داکہ نکل جاتی۔ وہ شام کے سورج کو دیکھتا تو اسے اپنا انجام نظر آتا۔ شاداب غنچوں کو دیکھ کر اس کا دل مچل جاتا، مگر سوکھے ہوئے پھولوں پر نگاہ پڑتے ہی اس کی چشم نم ہو جاتی۔ وہ کچھ ایسی اذیت سے دوچار تھا، جس میں ہر لمحہ خون میں رہا تھا۔

سکون کی تلاش میں اس نے اپنی دولت کو خرچ کرنا شروع کیا۔ اس نے اپنے دور کے عزیز و اقربا کو اپنے پاس رکھ لیا۔ کسی کے تعلیمی اخراجات، کسی کی بیماری کا علاج، کسی کی شادی بیاہ، وہ کسی نہ کسی طرح مالی امداد کر کے سکون خریدنا چاہتا تھا۔ اس کے عزیز اس کے اطراف تھے، اس کے اشارے پر سب کچھ ہو سکتا تھا۔ پھر بھی وہ اُداس تھا۔ افسردہ تھا۔ اس نے قلم کا سہارا لیا، اپنا درد اوراق پر بکھیر دیا۔ کاغذ کے صفحات اس کے ساتھی بن گئے۔ وہ لکھتا گیا۔ کتابیں جھپتی رہیں پھر وہ ایک نامور ادیب بن گیا۔ اس کے مداحوں کی کمی نہ رہی۔ اپنا دکھ درد، غم و الم کسک ٹڑپ، بے چینی و اضطرابی، محرومی اور نارسائی سب کچھ اس نے قلم کو بخش دیں۔ لوگ اس کی تحریر پڑھتے۔ آنسوؤں سے عبارت کو چومتے۔ وہ اپنی ہر کتاب کسی نہ کسی کے لئے وقف کر دیتا۔

”خون دل“ اندھوں کے لئے وقف تھی۔

”زخم دل“ بیواؤں اور یتیموں،

”درد دل“ خیراتی ہسپتالوں کے لئے۔

ہر کتاب کے کئی ایڈیشن چھپ چکے تھے۔ رائٹی اس نے لی نہیں بلکہ اپنے خرچ پر بھی کتاب فروخت کروا کر امدادی کاموں میں صرف کردی۔ پورا ایک کمرہ

الما ریوں سے بھرا پڑا تھا۔ جس میں اس کی تصنیفات رکھی تھیں۔ وہ بیشتر اوقات سوچا کرتا کہ اس کے بعد اس کی تخلیقات کا کیا ہوگا۔ ان تحریروں کا کیا بنے گا۔ کیا وہ دیمک کی نذر ہو جائیں گی۔ اس ذہنی انتشار نے اس کا رہا سہا سکون بھی چھین لیا۔ اگرچہ کہ جو عزیز اس کے قریب تھے اسے ہر طرح کا آرام دیتے۔ مگر بیمار ذہن کو سکون بخشنے والا مسیحا نہ مل سکا۔ وہ مسکراتا تو یوں محسوس ہوتا جیسے گہری دھوپ میں برسات ہو رہی ہو۔ وہ بولتا تو یوں لگتا جیسے صحرادوں میں کوئی گنگنا رہا ہو۔ درد ہی درد تھی اس کی زندگی۔ عالی شان مکان، قیمتی فرنیچر، بنک بیلنس، کار، کیا نہ تھا، اس کے پاس مگر پھر بھی وہ کتنا پیاسا تھا۔ اس کی پیاس وقت کے ساتھ بڑھتی رہی۔ اس کی بیمار روح ابتر ہوتی رہی۔ ماں کی ممتا، باپ کی شفقت، بھائی بہنوں کا پیار، محبوبہ کی چاہت بھی تو اس کے حصے میں نہ تھی۔ جب اس کا دل بھرتا تو وہ چاہتا اُسے کوئی لوریاں دے کر سلائے۔ جب اس کے آنسو چھٹک پڑتے تو وہ چاہتا کہ کوئی اس کے سر پر ہاتھ رکھے، جب وہ اکیلا ہوتا تو چاہتا کہ کوئی اس سے لڑے جھگڑے۔ کچھ مانگے، دیدے۔ جب وہ اپنے سر اپنے کو دیکھتا تو اس کا دل چاہتا کہ کوئی اس کے سینے میں چھپ جائے۔ اس کی آنکھوں میں بس جائے۔ اس کی رُوح میں ڈھل جائے۔ زندگی کی کمی کا اُسے شدت سے احساس رہا۔ اس احساس نے ایک نئے ناول کا روپ دھارا۔ آج صبح سے وہ غیر معمولی طور پر خوش تھا۔ ”شمعِ دل“ کا رسمِ اجرا تھا یہ کتاب اسی کی اپنی کہانی تھی۔ وہ یہ محسوس کر رہا تھا کہ آج اس نے اپنا غم کا غذ کے صفحات کو بخش دیا ہے۔

درد کو لٹا دیا ہے، ہال میں بھرے اس کے مداخلوں اور شائقین کو دیکھ کر اُسے جلنے کیوں آج بے پناہ خوشی ہو رہی تھی۔ سارے لوگ اسے اپنے مونس و غم خوار، ہمدرد و غم گسار محسوس ہو رہے تھے۔ تقریب کا آغاز ہوا۔ اس کے افسانوں پر تبصرہ

کیا گیا۔ ڈائس کے دائیں جانب ٹیبل پر اس کی نئی تخلیق کی ڈھیروں کتابیں رکھی تھیں وہ انھیں گھور رہا تھا۔ اس نے محسوس کیا کہ کتابیں بولنے لگیں ہیں چلنے لگی ہیں اور پھر اس کے قریب آگئی ہیں، تبھی اس کے سینے میں کوئی چیز جھنجھکی۔ جیسے کوئی شیشہ پتھر پر گرا ہو یا اس کا دل تھا جو خوشیوں کے پتھر کو سہہ نہ سکا۔ وہ تیسرا کر گر پڑا۔ لوگ دور کر قریب پہنچے۔ ساری زندگی تڑپتی ہوئی روح کو منزل مل گئی خوشیوں کے بھکاری کی کشکول خالی رہ گئی۔ سکون کے متلاشی کی نگاہیں ساکت ہو گئیں مضطرب دل کو جیسے قرار آگیا، وہ مرجھا تھا۔

مگر کون کہتا ہے کہ وہ مر گیا۔ وہ زندہ تھا اپنی تخلیقات میں اپنے مداحوں کے دلوں کی دھڑکن میں، مرتے مرتے اس نے اپنا درد و غم، اضطراب و کسک اپنی کہانیوں کو بخش دیا۔ اس کی کتابوں کے کمرے کو تالا لگ گیا۔ کتابوں کے اوراق الماری میں پھڑپھڑاتے رہے۔ کسی نے ان کی تڑپ کی طرف توجہ نہ کی۔ اس کا مکان نیلام پر لگایا جا رہا تھا۔ اس کے قیمتی فرنیچر اس کا بینک بیلنس اس کے عزیزوں نے لوٹ لیا۔ رات کو چوری کرنے والا چور کہلاتا ہے اور دن دھاڑے کسی کے مال پر ناجائز قبضہ کرنے والے کو کون سا نام دیا جائے۔ اس کے سامان کا ہٹوارہ ہوا اس کی دولت کا ہٹوارہ ہوا، گدھا اور چیلوں کی طرح اس کا سارا اثاثہ اس کے عزیزوں نے نوچ کھسٹ لیا۔

کیا سچ مح دولت زندگی سے پیاری ہے۔ وقت گزرتا گیا۔ الماری میں رکھی کتابیں سسکتی رہیں۔ اور فن کار کی روح تڑپتی رہی۔ پھر اچانک اس مکان میں ایک دوشیزہ نے قدم رکھا۔ ماحول پر سنسناٹا چھا گیا، رشتہ دار دم بہ خود رہ گئے اپنے ہاتھ لگے مال غنیمت کو اپنے دامن میں چھپانے کی سعی ناکام کرنے لگے۔

”تم کون ہو۔۔۔ تم کون ہو۔۔۔“ سبھی نے ایک ساتھ آنے والی سے

سوال کیا۔

”میں کون ہوں؟“ یہ بتانا مشکل ہے مگر مرنے والے کی چھوڑی ہوئی چیزوں پر میرا بھی حق ہے؟“ اس نے کہا۔  
 ”یہ کیسے ممکن ہے، تم کو ہم نے پہلے کہیں نہ دیکھا۔ اس نے کبھی تمہارے بارے میں نہیں بتایا، تمہارا اس کا رشتہ کیا ہے۔“

سوالات بارش کی بوچھاڑ کی طرح اس پر برس پڑے۔  
 اس نے ایک نظر گھر کے در و دیوار پر ڈالی، فرنیچر کی طرف نظر کی قیمتی اشیاء ساز و سامان ٹیبل پر رکھی، بنک پاس بک سبھی کچھ تھا۔ وہ ایک معنی خیز انداز سے مسکرائی۔

”اگر یہی سوال میں آپ سے کروں تو —“

”ہم اس کے عزیز ہیں۔“ سب نے مل کر کہا۔

”وہ میرا بھائی تھا۔“ ایک آواز آئی۔

”وہ میرا بھانجا تھا۔“ دوسری آواز آئی۔

”وہ میرا بھتیجا تھا۔“ تیسری آواز آئی۔

کشادہ اور وسیع ہال میں ان جملوں کی بازگشت ہونے لگی۔ وہ سنس پڑی۔

”مرنے والے نے کیا چھوڑا ہے اپنے پیچھے۔“ اس نے سوال کیا۔

”یہ سب کچھ جو تم دیکھ رہی ہو۔“

”بس اتنا ہی۔“ اس نے سوالیہ انداز سے پوچھا۔

”ہاں۔“

”اس کی دولت پر تم لوگوں کا حق کیسے ہو گیا۔“ وہ کہہ اٹھی۔

”اس کا سوائے ہمارے تھا ہی کون۔“ سب نے کہا۔

”میں جو ہوں۔“ اس نے اپنی اہمیت بتائی۔

”مگر تم۔۔۔ تمہارا اس کا کیا رشتہ ہے۔ کیا ثبوت ہے۔“

”میں اس کے بہت قریب ہوں۔ اس کی شہ رگ سے بھی زیادہ قریب مجھے اپنا حق چاہئے۔“

”کیسا حق۔ کس رشتے کا حق۔“ سبھی نے آواز بلند کی۔

”تم رشتہ پوچھ رہے ہو نا۔ تو سُنو!“

اس دنیا میں سینکڑوں بلکہ ہزاروں رشتے ہیں۔ ماں باپ کا رشتہ، بھائی بہن کا رشتہ، بیٹی بیٹے کا رشتہ۔ میاں بیوی کا رشتہ، غلام و آقا کا رشتہ، بیمار اور ڈاکٹر کا رشتہ۔ لیکن چند رشتے ان رشتوں سے الگ ہوتے ہیں۔ ہر جذبے کو رشتوں کے دھاگے میں باندھنا ضروری تو نہیں۔ بعض جذبے صرف محسوس کیے جاتے ہیں۔ ان کا کوئی نام نہیں ہوتا۔

”جیسے بادل اور بجلی کا رشتہ، پھول اور خوشبو کا، آنکھ اور کاجل کا، کلائی اور کنگن کا، دل اور دھڑکن کا۔ ساز اور آواز کا، روح اور جسم کا۔ میرا اور فن کار کا رشتہ بھی ایک ایسا ہی رشتہ ہے،۔۔۔ بہ غرض وہ بے ثبوت۔“

میں فن کار کی پرستش کرتی ہوں۔ اس کے فن کو پوجتی ہوں۔ اس لئے عقیدت کا پیرہن پہننے میں اپنے فن کار کے زخموں کے پھول چھنے آئی ہوں۔ انھیں میرے دامن میں ڈال دیجئے۔ وہ میری نگاہوں کا اُجالا، میری روح کی تازگی ہیں۔ ان کی زخم خوردہ تحریریں میری پلکوں کی چھاؤں میں رہیں گی۔ شاید اسی چھاؤں میں اس کا مضطرب دل سکون پالے۔ مجھے اس کی دولت نہیں چاہیے۔ یہ سب آپ لوگوں کو مبارک ہو۔ مجھے تو صرف وہ سرمایہ دے دیجئے، جو ان سکون سے زیادہ قیمتی اور ہیروں سے زیادہ نایاب ہے۔ میں اُسے اپنی پلکوں کی چھاؤں میں ہمیشہ ہمیشہ

کے لئے چھپا لوں گی اور وہ بلک بلک کر رو پڑی۔

عزیز و اقربا نے اطمینان کی سانس لی۔ ان کا خوف دور ہو چکا تھا۔ انہوں نے خوشی خوشی کمرے کو کھلوا دیا، جہاں اس کی تحریریں الماری میں پھر پھر اڑ رہی تھیں وہ تیزی سے اندر پہنچی۔ الماریاں کھولیں، ساری کتابیں جو گرد و غبار سے اٹ رہی تھیں اپنے آپ نکلنے سے صاف کر کے بڑی عقیدت سے اپنی آنکھوں سے لگایا اور پھر صندوق میں رکھ لیں۔ نوکر کی مدد سے صندوق ٹیکسی میں رکھوایا اور چل پڑی۔ فن کار کو سکون مل چکا تھا۔ اس کا تڑپتا دل اور زخمی روح اب کسی کے آنچل تلے آرام پا چکے تھے، وہ مگر بھی زندہ تھا، کسی کی ہلکوں کی چھاؤں میں۔

# منزل

اس نے ساڑھی کا آنچل سنبھالا اور کار میں سوار ہو گئی۔ کار ایک جھٹکے سے اسٹارٹ ہوئی اور چند ہی لمحوں بعد وہ ایک کشادہ سڑک پر کسی سطح کی طرح تیرنے لگی۔ دس منٹ بعد ہی کالج آگیا۔ ڈرائیور نے دروازہ کھولا۔ اور وہ کار سے اتر پڑی۔ گویا چاند بادلوں کی اوٹ سے نکل آیا ہو۔ بلکہ زرد رنگ کی ساڑھی میں وہ شعلہ نور بنی دہک رہی تھی۔ طلبا اپنی اپنی جگہ چپ کھڑے تھے جیسے جیسے وہ آگے بڑھتی رہی سلاموں کا سلسلہ شروع ہوتا گیا۔ کسی نے گڈ مارنگ میڈم کہہ دیا۔ کسی نے ہاتھ پیشانی پر رکھ لی۔ کسی نے جھک کر تسلیم بجا لائی، وہ دل آویز مسکراہٹ سے ان سب کا جواب دیتی رہی۔ گردن کی ہر جنبش پر ڈالی کے لچکنے کا گمان ہو رہا تھا۔ سیاہ چشموں کے پیچھے اس کی بڑی بڑی آنکھیں ماحول کا جائزہ لے رہی تھیں۔ کھٹاک کے ساتھ وہ آفس میں چلی گئی۔ پرنسپل صاحب سنبھل گئے۔

”گڈ مارنگ میڈم۔“ انھوں نے اسے دیکھتے ہی کہا۔

”گڈ مارنگ۔“ اور وہ کرسی پر بیٹھ گئی۔

”مسٹر داس میں آج اس لیے یہاں آئی ہوں کہ کالج کے سالانہ فنکشن



کے بارے میں فائنل decide کر لیں۔“ اس نے چشمہ اتارتے ہوئے کہا۔

”مسٹر داس اس کی اس ادا پر مرتے مرتے بچے۔“

”او کے میڈم۔ میں ابھی اسٹاف کو نوٹس بھیج دیتا ہوں تاکہ میٹنگ میں

سب آجائیں۔“ انھوں نے کال بیل بجاتے ہوئے کہا۔

”اٹ از آل رائٹ۔“ وہ اخبار اٹھاتے ہوئے بولی۔ مسٹر داس نے

چپراسی کو نوٹس حوالے کر دی۔

”میڈم اس بار چیف گیسٹ کے لیے آپ کی رائے میں کون موزوں رہے گا“

مسٹر داس اس کے چہرے کو پڑھنا چاہتے تھے اور اخبار درمیان تھا۔ اس

لیے انھوں نے سوال کیا۔

”مسٹر داس اس بارے میں میٹنگ میں بات ہو جائے گی۔“

وہ میز پر رکھے پیروٹ کو گھماتی ہوئی بولی۔ داس لاجواب ہو گئے، کچھ

لمحے یونہی گزرے ان سے رہا نہ گیا۔

”میڈم کافی یا ٹھنڈا —؟“

”نو تھینکس۔ ہاں میٹنگ کے وقت چائے منگوادیجئے گا۔“ وہ اٹھ

کھڑی ہوئی۔

”میں ایک منظر کلاس روس کو دیکھ لینا چاہوں گی۔ بہت دن بعد ادھر نکلی

ہوں، پتہ نہیں کلاسس کا کیا حال ہے۔“ اور وہ باہر نکل آئی۔

طلبا کی سرگوشیاں پھر سے جاری ہو گئیں۔ خوش بوؤں کا سیلاب اٹھتے وہ

ہر کلاس میں گھومتی رہی۔ مسٹر داس ہاتھ باندھے اس کے پیچھے تھے۔ دبی دبی

سرگوشیاں جارہی تھیں۔

”ہائے کیا قیامت ہے۔“

”خدا کی قسم، اگر بادشاہت بھی ملے تو اس اداے حسن پر قربان کر دیں“  
 ”بہت فرصت سے بنایا ہے جھگوان نے۔“  
 ”نشہ ہی نشہ ہے بس پے جاؤ۔“  
 ”اے کاش، نگاہ نازک بھی ادھر بھی اٹھ جاتی۔“

وہ سب کچھ سنتی رہی، لبوں پر پوشیدہ ہنسی تھی، سیاہ چشمے کے اندر دو بڑی بڑی آنکھیں مسرت سے سرشار تھیں اس کا اندازہ اور بھی دلکش ہو گیا۔ خراپا خراپا وہ ان سرگوشیوں کو سنتی ہوئی آگے بڑھتی رہی۔ اسٹاف روم میں لکچرس خوش گپیوں میں مصروف تھے جیسے ہی خوش بو کا جھونکا ان کی سانسوں کو معطر کر گیا وہ چونک پڑے۔ ستیش کے ہاتھ سے کتاب چھوٹ کر گر گئی۔ احسن نے ٹائی کی گرہ ٹھیک کر لی۔ آرون نے چہرے پر مسکراہٹ لانے کی کوشش کی۔ جیکب نے سر کی جنبش سے ماتھے پر پڑے بالوں کو پیچھے ہٹایا۔ ہر شخص اپنے تئیں اُسے جیتنے کی ناکام کوشش میں تھا۔ اس نے ایک طائرانہ نگاہ سب پر ڈالی، سیاہ چشمہ ہٹایا تو زمین و آسمان باہم ہو گئے۔ اب نشاطِ خلق کو ترکرتا ہوا محسوس ہوا۔

”یہ ہمارے کالج کے فائونڈر مسٹر عمران بیگ کی صاحبزادی مس آفرین ہیں۔“  
 مسٹر داس نے اس کا تعارف نئے لکچرس سے کروایا۔ آرون نے تو بے ساختہ مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھا دیا، اور اس نے ”ہیلو“ کہہ کر بات ختم کر دی۔ سینوں کے اندر دھڑکتے دل ایک پل کو رک گئے۔ روشن آنکھیں لمحہ بھر کو بند سی ہو گئیں۔ وہ چلی گئی۔ اور اس کے جاتے ہی جیسے تیز ہوا کے جھونکھوں سے کتاب کے اوراق پھڑپھڑانے لگتے ہیں۔ کالج کی فضا میں اسی کے متعلق تیز تیز باتیں ہونے لگیں۔

وہ گھر پہنچی پرس کو میز پر پھینک دیا۔ سینڈل اچھال دی۔ اور گدے دار

بستر پر پیٹ کے بل گر پڑی۔ سرہانے رکھے اسٹریو کو آن کیا۔ انگلش دھن بجنے لگی۔ وہ ایک اداۓ ناز سے اٹھی اور فلور پر اس کے پیر تھرکنے لگے کسی جنگل کی مورنی کی طرح وہ دھن دھن کرتی رہی، کرتی رہی، کرتی رہی۔۔۔۔۔ پسینے کا آبشار بہہ نکلا سانس پھولنے لگی اور وہ تھک کر آئینے کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔ اپنے سر پلے پر نگاہ ڈالی جسم کے سارے خطوط اب بھی دل آویز تھے۔ کہیں کوئی بدنمائی بھی نہ تھی۔ کتنی محنتوں سے اس نے اپنے آپ کو سنبھالے رکھا، اس کے نزدیک عورت کی انا اس کا لازوال حسن میں پوشیدہ تھی۔ وہ سمجھتی تھی کہ حسن میں وہ طاقت ہے جو بادشاہ سے لے کر ایک فقیر تک کو بھی سجدہ گزار بنا سکتا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ اس نے دلوں کو کھلونا سمجھا۔ محبت کو ڈھونگ اور وفا کو پاگل بن جانا۔ اس کی تمام تر توجہ حسن و جمال کی آرائش پر گزرتی۔ اس لیے عمر کی چالیس منزلیں کھو کر بھی وہ کنواری اور دلکش تھی۔ بیگ صاحب نے آخری سانس تک اسے نصیحت کی کہ وہ کسی کو اپنالے۔ مگر آفرین ——— وہ یہ سمجھتی تھی کہ کل کو اگر وہ کسی کی بیوی بنے گی تو پھر خود بخود ایک دن وہ بھی آئے گا جب وہ ماں بن جائے گی۔ تب اس کے حسن و جمال کا کیا ہوگا۔ اس کے لب و رخسار کے جلوؤں کا کون دلوں کو ہوا، وہ اس تصور سے ہی کانپ جاتی اور پھر اس نے روشنی کے سچے پیار کو اپنی انا سے کچل کر رکھ دیا۔

”میں نہیں چاہتی کہ میرا رنگ و روپ اجرے مجھے کھلی فضاؤں سے پیار ہے، گوشہ تنفس سے نہیں۔ پیار و وفا کی باتیں محض جذبات کا بے ڈھنگا پن ہے صبا کے جھونکے مقید نہیں ہو سکتے، ہاں بل بھر کو خوش بودے کر گر سکتے ہیں۔ مجھ سے کوئی اس نہ رکھو تو بہتر ہے۔“

اور پھر وہ اس کی زندگی سے دور چلا گیا۔ بیگ صاحب آہ بھر کر رہ گئے۔ مگر

آفرین — وہ تو دریا کے ایک تند و تیز موج کی طرح آگے بڑھ گئی تھی۔ وہ اس قدر خود پسند ہو گئی کہ اپنی تعریف سُننا اس کے لیے ہابی بن گیا۔ کلبوں میں ہٹلوں میں پچھرس میں ہر جگہ وہ اپنے حسن کی پوری آرائش کے ساتھ موجود ہوتی تاکہ تیرنگاہ کے گھائل بس تڑپ کر رہ جائیں۔ یہی وجہ تھی کہ شہر کا ہر نوجوان اس سے واقف تھا جب لوگ اسے دیکھ کر سرد آہ بھرتے تو اس کے سارے جسم میں خنکی سی دوڑ جاتی کوئی جب اس کو محبت بھرے خط لکھتا تو اس کے لئے مذاق کا موضوع بن جاتا کوئی اس کے شُسن کی تعریف کرتا تو وہ اس کے سامنے ایسی قابل بن کر جاتی کہ اس کا پرستار آہ بھرنے کی ہمت کے بغیر ہی جان دیدے۔ زندگی نے اسے حُسن و دولت کے ساتھ ساتھ آزادی بھی دیدی تھی۔ وہ خود پسندی اور خود ستانی کا شکار تھی۔ اُسے دیکھ کر کوئی یہ نہ کہہ سکتا تھا کہ وہ چالیس سال کی کوئی عورت ہے۔ بلکہ گمان بھی ہوتا تھا کہ ابھی پچیس بہاریں دیکھی ہیں۔ اس کے متناسب اعضا اور پھر اس کا آرائشِ جمال گویا کر بلا اور نیم چڑھا۔ اسے ناز تھا کہ قدرت نے اسے شباب کی دولت تاحیات بخش دی ہے۔ اس کی زندگی کا مقصد آرائشِ حُسن تھا، اور وہ اسی محور کے گرد رقص کر رہی تھی

آج اسکول کا سالانہ جلسہ تھا، آج وہ کچھ زیادہ ہی بنی سنوری تھی۔ اس کے ایسٹج پر آتے ہی لاکھوں دلوں میں انار چھوٹ گئے۔ آج وہ خود کو مصر کی قلوبیطرہ سمجھ رہی تھی بکپول پروگرام کے بعد انعامات کی تقسیم کا سلسلہ چلا۔ کالج کے ذہین طلبا کو انعام اول دیا جا رہا تھا۔ ایک لڑکا آگے بڑھا، جوانی کی طرف ابھی ابھی رواں دواں تھا۔ چہرے پر تازہ گلاب کی کشش تھی۔ اور مردانہ وجاہت نے کچھ اور بھی خوب رو کر دیا تھا۔ گلابی ہاتھوں پر کالے کالے گھنے بال — انعام دیتے ہوئے وہ کچھ چونک سی گئی۔ نگاہ اٹھا کر دیکھا تو اس غنیچہ شاداب پر پیار

آگیا۔ پہلی بار اس کے دل میں ہلکی سی کسک محسوس ہوئی۔ دل کے آس پاس کوئی چیز ٹوٹ کر بکھرتی دکھائی دی۔ وہ انعام لے کر اتر گیا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ کسی نوجوان نے اسے بھرپور نظروں سے نہیں دیکھا، اس کے حسن کا جائزہ نہیں لیا۔ بیکارگی اس کے چہرے پر ہزاروں بل پڑ گئے۔ مگر اس نے خود کو سنبھالا اور فنکشن کے اختتام سے پہلے سرور کا بہانہ کر کے اٹھ گئی۔ چلتے چلتے اس نے پرنسپل صاحب سے کہہ دیا کہ وہ کالج میں اول آنے والے اس طالب علم کو اس کے ہمراہ بھیج دیں، کیوں کہ رات زیادہ ہو چکی تھی اور تنہا جانے سے وہ گھبراہری تھی۔ مسٹر اس نے اُسے آواز دی۔

”شنید، میڈم کے ساتھ گھر جاؤ رات بہت ہو گئی ہے، وہ تنہا جاتے ہوئے گھبراتی ہے۔“

و اس تو چاہتے تھے کہ کاش قربت کا یہ ساتھ انھیں مل جاتا مگر . . . . .

شنید نے ایک بار نگاہ اٹھا کر اس کو دیکھا یہ نگاہ پہلی بار آفرین کو گھائل کر گئی، وہ تڑپ کر رہ گئی اور کچھ ایسی نظروں سے اُس نے شنید کو دیکھا کہ وہ تاب نہ لاسکا۔ نگاہ جھکا کر بس اتنا کہہ سکا۔

”چلئے — اور پھر دونوں کار میں بیٹھ گئے۔“

وہ ڈرائیو کرتی رہی۔ شنید چپ چاپ اس کے بازو بیٹھا رہا۔ چند لمحوں کے سکوت کے بعد آفرین نے سوال کیا۔

”لگتا ہے تم نے چوری کی ہے۔“

”جی . . . . .“ وہ حیرانی سے پوچھا۔

”ہاں اور نہیں تو کیا۔ تم تو یوں چپ چاپ بیٹھے ہو، لگتا ہے، پولیس آفیسر کے ہمراہ جیل کو جا رہے ہو۔“

”اچھا . . . . .“ اس بار وہ ہنس پڑا۔ موتیوں کی قطار جگمگائی۔

”تم کب سے اس کالج میں ہو۔“ آفرین نے پوچھا۔

”بس اسی سال جوائن کیا ہے۔“ اس نے جواب دیا۔

”اس سال کا سٹیلڈ تم نے جیت لیا۔ مٹھائی نہیں کھلاؤ گے۔“

آفرین کی نگاہ میں کئی سوال تھے۔ اس نے منظر اٹھا کر دیکھا اور پھر جھٹکالیا۔

”جواب نہیں دو گے۔“ آفرین نے اصرار کیا۔

”جی..... وہ میں.....“ وہ بوکھلا گیا۔

”بڑے شرمیلے ہو۔ چلو ہم خود تمہیں مٹھائی کھلا دیں گے۔“

آفرین کا گھر آچکا تھا۔ جبراً وہ اتر گیا۔ شرمایا شرمایا سا سہا سہا سا وہ اس کے

پچھے چل پڑا۔ ڈرائنگ روم کے دبیز صوفوں پر وہ بیٹھ گیا اس کی نگاہیں کمرے کا

جائزہ لے رہی تھیں تبھی کسی نے اس کے منہ کے قریب مٹھائی لا کر رکھ دی۔

”آپ..... یہ تکلف.....“ وہ رک گیا کچھ نہ کہہ سکا۔

”شنید تم تو بڑے شرمیلے ہو، اب چھوڑو یہ تکلف اسے اپنا ہی گھر سمجھو

مٹھائی کھا لو۔“

اس نے حلوہ سوہن کا ٹکڑا اٹھا کر کہا۔

”نہیں پہلے آپ لیجئے نا آنٹی.....“

اس نے مٹھائی آفرین کے منہ میں رکھ دی اور ٹھیک اسی لمحے آفرین کو

محسوس ہوا جیسے وہ زمین میں میلوں اندر دھنسی جا رہی ہے۔ جیسے دیرانے میں

ایک ہی صدا گونج اٹھی ہے۔ اس کی آنکھوں کے آگے اندھیرا سا پھیل گیا۔ دھوئیں

کے بادلوں میں جیسے وہ گھر گئی، وہ خود کو میلوں پچھے محسوس کرنے لگی۔ وہ بے جان سی

صوفے پر سر کو ٹیک لگا کر بیٹھ گئی۔

”آنٹی..... آنٹی..... آپ کو کیا ہو گیا۔“

شنید نے اس کا شانہ ہلا کر پوچھا۔ وہ کچھ جواب نہ دے سکی، بس اتنا کہا۔  
 ”تم گھر واپس جاؤ۔ میں کل تم سے کالج میں مل لوں گی۔ اب مجھے اکیلا چھوڑ دو“  
 ”لیکن آپ کی طبیعت.....“ وہ جانا نہیں چاہتا تھا۔  
 ”نہیں مجھے کچھ نہیں ہوا۔ تم چلے جاؤ رات بہت ہو گئی۔“

اور شنید دروازے سے باہر نکل گیا۔ شنید کے جاتے ہی آہستہ سے وہ صوفے سے اٹھی، آئینے کے روبرو کھڑے ہو کر اس نے خود کو دیکھنا شروع کیا۔ پسینے سے اس کا میک اپ نکل چکا تھا۔ چہرے کی دلکشی تو تھی، مگر وہ تازگی نہیں، اُداس چھوٹوں جیسے اس کے گال نظر آ رہے تھے۔ آنکھوں میں چمک تو ضرور تھی لیکن آنکھوں کے حلقے سیاہ تھے اور یہ ڈوبتی شام کی اُداسی کے غماز تھے۔ ہونٹوں کا خم اب بھی دلکش تھا، مگر سیلا پن باقی نہ رہا بلکہ پیڑیاں سی جم گئیں۔ اس کا چہرہ یوں لگ رہا تھا جیسے چاندی کے ورق میں لپیٹی گولی سے ورق چھوٹ جائے۔ تب ہی اس نے سر پر ہاتھ پھیرا۔ سیدھی جانب کو چاندی کے باریک باریک تار چمک رہے تھے، اُسے یاد آیا کہ آج وہ ”مراٹیکل“ نہ جاسکی۔ اس کی اس بھول نے حقیقت کو بے نقاب کر دیا۔ شنید کے الفاظ اس کے کانوں میں گونجنے لگے۔ آنٹی آنٹی — وہ سسک پڑی۔

کالج کے صدر دروازے پر آفرین کو اترتا دیکھ کر طلباء سے لے کر اسٹاف کے سارے لوگ حیرت زدہ رہ گئے۔ بہتوں کو اپنی آنکھوں پر یقین نہ آیا، لوگ پلکیں جھپک جھپکا کر دیکھنے لگے، سب حیران تھے کہ آج مس آفرین کو کیا ہو گیا وہ ایک شگفتہ نوخیز کلی سے مڑجھایا ہوا پھول کیسے بن گئیں۔ وہ ایک الٹرا مین سے پُر وقار دوشیزہ کیسے بن گئی۔ سفید ساڑی کے کنارے گہرے نیلے تھے۔ اس نے ساڑی کو اپنے اطراف یوں لپیٹ لیا تھا، مبادا کوئی خطوط بکھر نہ پائے۔

چہرہ میک اپ سے عاری تھا۔ اب کالج کی فضا میں نہ دینی سرگوشیاں تھیں، نہ فقرے بازیاں اور نہ ٹھنڈی آنہوں کا دھواں۔ وہ بڑے وقار سے چلتی ہوئی آفس میں گئی۔ داس صاحب اسے دیکھ کر حیران تھے۔

”مجھے شنید سے ملنا ہے۔“

اس نے اتے ہی کہا اور پھر کچھ ہی دیر بعد دروازہ کھلا۔ اس کی پیٹھ دروازے کی جانب تھی وہ آنے والوں کو دیکھ نہ سکی، صرف قدموں کی چاپ اس نے سنی۔ ”محترمہ آپ نے شنید کو سٹھائی کھلانے کہا تھا۔ اس کے لیے میں خود اسے لیے حاضر ہوا ہوں۔“

اس آواز پر اس نے گھوم کر دیکھا تو بس دیکھتی ہی رہ گئی۔ روش اس کے سامنے تھا۔ ”دوڑ پیچھے کی طرف اے گردش ایام تو“ کے مصداق وہ بہت پیچھے چلی گئی۔ بائیس سال کا طویل وقفہ گزر چکا تھا۔ بہار اگر رخصت ہو چکی تھی۔ ”روش..... تم.....“ وہ تھم سی گئی۔

”شنید میرا بیٹا ہے، اور یہ میری بیوی شہلا“

اس نے اپنے بازو ٹھیری ایک خوب صورت عورت کی جانب اشارہ کر کے کہا۔

آخرین نے دیکھا کہ وہ آج دنیا کی سب سے حسین عورت کو دیکھ رہی ہے جس کا یہ انداز اسے انوکھا لگا، کیوں کہ ان آنکھوں میں ممتا کی چمک تھی۔ پیشانی پر حوروں کا تقدس، لبوں پر دعائیں۔ یوں لگا جیسے وہ جنت میں گم ہو، وہ مہوت سی کھڑی ہو گئی۔ اپنی اس شکست پر نہ وہ رنجیدہ ہو سکی اور نہ خوش..... بار کے پیچھے جیت کا یہ انداز اس کے دل کو بھا گیا۔

”آخرین شنید تمہارے سامنے کھڑا ہے۔“



وہ چونک گئی اس نے دیکھا شنید ہاتھوں میں مٹھائی کا ڈبہ لئے مسکراتا  
 اسے دیکھ رہا تھا۔ ایک لمحے کے لئے آفرینِ جنت میں آگئی۔ بے اختیار متا کا جذبہ  
 پیار بن کر شنید کی پیشانی پر جم گیا۔ اس نے شنید کو گلے لگالیا۔ ان گنت  
 بوسے اس کی پیشانی پر ثبت کر دیے۔ آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے۔ اس نے  
 محسوس کیا کہ برسوں کی کھوئی ہوئی جنت آج اُسے مل گئی تھی۔ سب کچھ کھو کر  
 اس نے بہت کچھ پالیا تھا۔ اس جنت کو حاصل کرنے اُس نے کئی جہنموں کی  
 آگ برداشت کی تھی، لیکن پھر بھی وہ مطمئن تھی پرسکون تھی۔ گویا طویل مسافت  
 طے کرنے والے راہی کو منزل مل گئی ہو۔

# بسیرا

”بسیرا کا مپلکس“ کا آج افتتاح تھا۔ پوری عمارت نور کے سانچے میں ڈھلی ہوئی تھی۔ لاوڈ اسپیکر پر گیتوں کا شور تھا۔ رنگ برنگی جھنڈیاں گلی کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک منڈوے کی شکل میں لگ گئی تھیں۔ آہنی گیٹ کے اوپر We Come کا بورڈ جگمگا رہا تھا۔ محلے کے نوجوان بچے بوڑھے سبھی یہاں جمع تھے۔ اس محلے میں بھی تو ایک عمارت تھی جو آسمان سے باتیں کر رہی تھی۔ چار سال کی محنتوں اور کاوشوں کا صلہ آج ایک عالی شان عمارت کی شکل میں موجود تھا۔ اس بلڈنگ کے فینانسرس، آرکیٹیکس، سپروائزرس، مستری اور مزدور سبھی شاداں و فرہاں تھے۔ منسٹر کے ہاتھوں اس بلڈنگ کا افتتاح ہونے والا تھا۔ ابھی منسٹر کے آنے میں دیر تھی۔ انتظار کے یہ لمحے عرق کلاب میں معطر تھے۔ اگر بتی کی خوشبو فضا میں جھبک رہی تھی۔ پھولوں کے گجرے برفلیٹ کے دروازے پر لٹک رہے تھے۔ گیٹ کے دائیں بائیں سے بندھا ہوا ریشمی فیتہ اپنے کٹنے کا منتظر تھا۔ بالکین فلیٹ اپنے اپنے بسیرے میں پناہ لینے کے منتظر تھے۔ ان لوگوں نے کامپلکس کے آغاز کے ساتھ ہی فلیٹ بک کروا لئے تھے، اور اب افتتاحی تقریب کے منتظر تھے۔

رحمت بھی ان سب میں شریک تھا۔ اپنے کھر درے ہاتھوں کو دیکھتا ہوا وہ پھولانہ  
 سہاتا تھا۔ کتنی جانفشانی اور لگن سے اس نے اس کی ایک ایک اینٹ کو ڈھویا تھا۔  
 سمنٹ اور ریت میں کتنی بار ان ہاتھوں کو جھگویا تھا۔ اپنے ان میلے کچیلے ہاتھوں کے  
 کرشمے سے وہ خود حیران تھا۔ اپنے ان ہاتھوں کی لکیروں کو گھورتا ہوا وہ ماضی کے دھند  
 میں جیسے کھو گیا۔

جس وقت وہ اپنے گاؤں سے نکلا تب اس کے بدن پر کپڑوں کے سوا کچھ نہ تھا۔  
 ”رحمت بیٹا! زندگی پہاڑ جیسی ہے اس کی چوٹی تک پہنچنے کن کمزور راستوں  
 کا سہارا لے رہے ہو۔ یہ اُجڑے ہوئے کھیت کی یگدڑیاں اب تمہیں سکون نہیں دے پائیں گی  
 پچھلے دو برس سے خشک سالی نے پریشان کر رکھا ہے۔ کب تک ان پتھروں سے دودھ  
 نکالنے کی کوشش کرو گے۔ تمہاری تقدیر تمہارے ہاتھ میں ہی ہے۔ اپنے ہاتھ کی ان لکیروں  
 میں ہی اپنا راستہ تمہیں مل جائے گا۔ میں بوڑھا ہو چکا ہوں۔ ناز و عمر کی سیڑھیاں تیزی  
 سے طے کرنے لگی ہے۔ میرے کمزور کا ندھے اسے کب تک سنبھالیں گے۔ بیٹا۔ اپنی  
 امانت جتنی جلد ہو سکے، میرے پاس سے لے جاؤ۔ غریب کا سہارا اس کی جوان بیٹی ہے  
 خطرہ قدم قدم پر ہے۔ لیٹرے ہر جگہ بستے ہیں۔ چہروں پر بھروسہ نہیں کیا جاسکتا۔ بہتر  
 یہی ہوگا کہ تم شہر جا کر کچھ کمانے لگ جاؤ اور ناز کو اپنالو۔“

جمن چاچا کی مایوس آواز میں التجا تھی۔ وہ رونہ کر سکا۔ حقیقت بھی تو تھی۔ فصل  
 کٹنے کا انتظار تو اس وقت ہو سکتا تھا، جب بیج بوئے گئے ہوں۔ — یہاں تو بنجر  
 ہی بنجر تھا۔ پھر شجری کیسے آرزو کر سکتا تھا وہ۔ اپنے ہاتھ کی لکیروں پر بھروسہ کرتا ہوا وہ  
 شہر جانے تیار ہو گیا۔

جانے سے پہلے وہ نازو کے پاس جا پہنچا وہ پیمپل کے پیر تلے بیٹھی اپنے ہتھیلیوں  
 پر ہندی رچارہی تھی۔

”نازو۔“ اس نے پکارا وہ چونک کر ادھر ادھر دیکھنے لگی، کسی کو ناپاکر وہ پھر اپنے کام میں منہمک ہو گئی، کیونکہ وہ جانتی تھی کہ یہ اس کا باؤ لادل ہے۔ جو اکثر رحمت کی آوازیں اس کا نام پکارنا رہتا ہے مگر پھر ایک بار شو شو کی آواز پر اس نے گھوم کر پیچھے دیکھا، وہ دُور کھڑا ہاتھ سے اُسے بلارہا تھا۔ نازو ادھوری مہندی، مٹھیلی پر لگائے اس کی طرف بڑھی چلی آئی۔

”کیوں آئے ہو۔“ اس نے انگوٹھے سے زمین کریدتے ہوئے پوچھا۔  
 ”میں شہر جا رہا ہوں۔!!“ وہ ایک پل رک گیا۔ نازو کے چہرے پر آئے ہوئے تاثرات جاننے لگا۔

”کیوں۔“ نازو کی آواز بھگکتی ہوئی محسوس ہوئی۔

”تیری اس ادھوری مہندی کو پورا کرنے۔ نازو گاؤں میں اب کچھ نہیں، جب کمانہ سکوں گا تو تو تجھے اپناؤں گا کیسے۔ ساری عمر یونہی تو نہیں چل سکتی۔ مجھے کچھ تو کرنا ہے۔ شہر میں روزی کا مسئلہ حل ہو ہی جائے گا۔“  
 ”کب لوٹو گے۔“ اس نے معصومانہ سوال کیا۔

”سنا ہے شہر میں بڑی بڑی بلڈنگیں بنتی ہیں۔ ان کا کام چار پانچ سال سے پہلے ختم نہیں ہوتا۔ ایسا ہی کوئی کام مل جائے تو بے فکری سے چند سال گزر جائیں گے۔ پھر آئندہ کوئی نہ کوئی ذریعہ نکل ہی جائے گا۔ یہ ہاتھ سلامت ہیں تو غم کا ہے کارجن چاچا کہتے ہیں کہ ہاتھ کی لکیروں میں ہماری منزل چھپی ہوئی ہے۔“ اس نے اپنے ہاتھوں کو دیکھ کر کہا۔

”تم مزدوری کرو گے۔“ اس نے اس کے ہاتھ تھام لئے۔

”اور نہیں تو کیا۔؟ یہاں ہل چلاتا رہا وہاں اینٹیں ڈھونڈوں گا۔“  
 ہوں کام سے عار کیا۔“ اس کے لہجے میں عزم تھا حوصلہ تھا۔

”اللہ تم کو حفاظت سے رکھے، جلد ہی نوٹ آنا۔ میں تمہارے لئے دعا کرتی رہوں گی۔ تم جب لوٹ کر آؤ گے تو پیر صاحب کی مزار پر فاتحہ دلاؤں گی۔ نازو بھی جیسے امیدوں کی تلاش میں نکل گئی۔“

”تو میں چلتا ہوں۔ خدا حافظ“ اور وہ خاموشی سے سنسان پگڈنڈی کے راستے چل پڑا۔ نازو بڑی دیر تک اُسے دیکھتی رہی، یہاں تک کہ اس کا ہیولا ایک نقطہ بن گیا اور یہ نقطہ نازو کی آنکھ میں سمٹ کر رہ گیا۔

رحمت کو شہر آتے ہی مشکلوں کا سامنا تو کرنا پڑا مگر اس نے ہمت نہ ہاری وہ جگہ جگہ مزدوری کے لئے پھرتا رہا، اڈے پر بیٹھتا تو کوئی یومیہ کام لے کر چلتا کر دیتا اس طرح تو زندگی بے فکری سے گزرنے لگتی تھی۔ آخر کار ایک ایسا موقع آ گیا جب اس نے دیکھا کہ ریڈ ہلز کے ایک مقام پر پرانی عمارت کو ڈھایا جا رہا تھا وہ بڑی آس لے کر وہاں پہنچا۔

”بھائی۔ یہ بلڈنگ کیوں توڑ رہے ہیں۔“ اس نے کسی مزدور سے پوچھا۔

”یہاں ایک بڑی بلڈنگ بننے والی ہے۔ اگلے ماہ کام شروع ہو جائے گا۔“

اس نے جواب دیا۔

”کیا مجھے یہاں کام مل سکتا ہے۔“ اُمید سے بھرا سوال تھا۔

”کیوں نہیں وہاں بڑے بابو بیٹھتے ہیں جا کر ان سے پوچھ لینا۔“ وہ سیدھے بڑے بابو کے پاس پہنچا۔

”بابو صاحب۔ ہم کو مزدوری لگا دیجئے، بھوکوں مر رہے ہیں ہم۔“ اس نے ہاتھ جوڑ دیئے

بابو صاحب نے چشمے کی اوٹ سے اس کا جائزہ لیا۔ لمبا قد۔ صحت مند جسم، صورت شکل بھی اپنے اندر جاذبیت رکھتی تھی۔ ہاتھوں سے محنت کا اندازہ کیا جاسکتا تھا۔

” اگلے ماہ سے اس کامپلیکس کا کام شروع ہوگا۔ پورے چار سال اس کام کو لگ جائیں گے۔ تمہیں ہم سے کنٹراکٹ کرنا ہوگا۔

اس کنٹراکٹ کے تحت تم صرف اسی کامپلیکس پر کام کرو گے۔ یومیہ اجرت کے بدلے ہفتہ وار اجرت ملا کر سگی، کام کے دوران کوئی بہانہ بازی اور بے ایمانی سے بات نہیں بنے گی۔“ بابو صاحب نے تفصیل سمجھا دی۔

وہ بخوشی راضی ہو گیا۔ چار سال تک کے لئے بے فکری ہو چکی تھی۔ کنٹراکٹ پر دستخط کر کے وہ گاؤں واپس چلا آیا۔ اب کام شروع ہونے میں چند ہی دن رہ گئے تھے۔ اس نے سوچ لیا کہ کچھ پیسے جمع کرنے کے بعد ہی وہ نازو سے بیاہ کر لے گا۔ کیونکہ شہر لے جا کر نازو کو رکھنے کا مسئلہ بھی تو بڑا اہم تھا۔

آخر کار کامپلیکس کا کام شروع ہوا۔ رحمت پوری دل جوئی اور لگن سے کام کرنے لگا۔ دن بھر کی تھکن کے بعد راجو بھیا کی دوکان پر بنے چبوترے پر وہ سو جاتا کبھی نیند اس پر غالب آجاتی اور کبھی خواب نیند پر۔

عمارت بنتی رہی، سمنٹ اور چونے کی شکل بدلنے لگی۔ اور ادھر رحمت کے ہاتھوں کی لکیریں بھی بدلنے لگی تھیں۔ بلڈنگ کا گراؤنڈ فلور مکمل ہو چکا تھا۔ پچھلا حصہ گیرج کے لئے مخصوص تھا۔ بڑے بابو نے اسے اجازت دے دی تھی کہ وہ راجو بھیا کے دوکان کے چبوترے پر سونے کے بجائے اس تعمیر شدہ گیرج میں مکین رہے۔ رحمت کو اس سے زیادہ کیا چاہیئے تھا۔ وہ بڑے آرام سے رہنے لگا۔

پھر اچانک عمارت کی تعمیر روک دینی پڑی۔ بازار میں سمنٹ کا اخراج ہو گیا تھا سمنٹ نہ مل سکی تو کام بند کر دینا پڑا۔ بابو صاحب نے مزدوروں سے چھٹی کا اعلان کر دیا۔ رحمت کو تو جیسے پر لگ گئے وہ بابو صاحب کے پاس جا پہنچا۔

”بابو صاحب میں اپنے گاؤں جا کر آؤں گا۔ اس نے شرماتے ہوئے کہا۔

”مزدور جاؤ مگر کام شروع ہونے سے پہلے آجانا۔“

”بابو صاحب - میں شادی کرنے جا رہا ہوں۔“

”یہ تو بڑی خوشی کی بات ہے۔“

”میں اپنی نازو کو لا کر کہاں رکھوں۔ ۶ رحمت کچھ رُک رُک کر بولا۔

”اس میں پریشانی کی کیا بات ہے۔ اب جس زیر تعمیر گرج میں تم ہو اس میں رہ لینا، کوئی پردہ وغیرہ باندھ کر کمرے کی شکل دے دو اسے۔“ بابو صاحب نے مشورہ دیا اور رحمت کے تصور میں انار چھوٹنے لگے۔

جب وہ ایک شہری بابو بنا، گاؤں پہنچا تو بچے تالیاں پیٹنے لگے اور پھر یہ تالیاں ڈھولک کی تھاپ میں بدل گئیں۔

نازو کے ہاتھوں کی ہندی مسکرانے لگی اور چہرے کا چاند جگمگانے لگا۔ نازو بڑی آب و تاب کے ساتھ اس کے گھر میں جلوہ گر ہوئی

چھٹیاں ختم ہوئیں تو وہ نازو کو لے کر شہر پہنچا۔ گرج رحمت اور نازو کے ملے جلے قہقہوں اور دبی دبی سرگوشیوں سے آباد ہو گیا۔ کامپلکس کا کام بھی شروع ہو چکا تھا، مزدوروں کے ہاتھ مشین بن گئے۔ ان کے ہاتھوں کا جادو سرچڑھ کر بولنے لگا۔

اب بلڈنگ پانچویں منزل میں داخل ہو چکی تھی۔ یوں سمجھیے کہ یہ اس کے عنفوان شباب کا زمانہ تھا۔ اس عالم میں اس کے حُسن کا جادو ایک مزدور گردھاری پر چل گیا۔ بیچارہ پانچویں منزل سے کام کرتے ہوئے پھسل کر گر پڑا۔ رحمت کو اس کی موت کا بڑا صدمہ ہوا۔ ایک عدد انسانی جان کا خون اس بلڈنگ میں پانی کی طرح استحال میں آ گیا، رحمت جانتا تھا کہ گردھاری کا کنبہ بڑا ہے۔ اور مزدوری ناکافی۔ اکثر وہ فاقے کرتا تھا۔

اسی آنکھ مچولی میں دن گزر گئے اور بسیرا کا میپلکس کی افتتاحی تقریب کا آغاز ہوا۔ اس رات اچانک ہی مناکو بہت بخار آگیا۔ ڈاکٹر کو دکھانے پر اس نے نمونہ کا شبہ بتلایا۔ رحمت اور نازو دونوں ہی اس کے لئے پریشان تھے۔ دوا دے کر وہ افتتاحی تقریب میں شرکت کے لئے جا پہنچا۔ رہ رہ کر اسے ایک گمان ایک خدشہ ستا رہا تھا، کہیں ایسا نہ ہو۔

”بسیرا اس سے چھین جائے تب وہ کہاں جائے گا۔؟“ لیکن ایک خیال دل کو ڈھارس دیتا رہا کہ منسٹر صاحب آئیں گے تو وہ اپنے لئے بسیرے سے بسیرا مانگ لے گا۔

آخر کار بڑے انتظار کے بعد منسٹر صاحب کی آمد ہوئی، بینڈ باجوں سے استقبال کیا گیا اور پھولوں کے گجرے پہنائے گئے، پھر انھوں نے باواز بلند اپنی تقریر شروع کی۔

”..... ہمارے شہر میں ایسی ہی عمارتوں سے رونق پڑھے گی۔ مکانوں کی قلت کا مسئلہ بھی خود بخود حل ہو جائے گا۔۔۔۔۔ ایسے کامپلکس سے آپس میں اتفاق و اتحاد بھی بڑھتا رہے گا۔ لوگ مل جل کر رہنے کو ہی اپنا نصب العین سمجھیں گے۔۔۔۔۔ میں ان تمام منتظمین کو مبارک باد دیتا ہوں۔ جنھوں نے بڑے عزم بڑے حوصلے کے ساتھ اس عمارت کی تکمیل کی۔۔۔۔۔ ہمیں ناز ہے ان مزدور بھائیوں پر جن کے ہاتھوں نے مٹی اور پتھر کا جادو جگادیا۔ دنیا کی جتنی عالی شان عمارتیں ہیں سبھی ان مزدوروں کی رہیں منت ہیں۔ یہ نہ ہوتے تو آج قطب مینار نہ ہوتا، تاج محل نہ ہوتا، لال قلعہ نہ ہوتا، چار مینار نہ ہوتا، اور نہ کوئی عمارت ہوتی جسے دیکھ کر عقل دنگ رہ جائے اور ہوش گم ہو جائیں۔ اس لئے میں خاص طور پر اپنے مزدور بھائیوں کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔“..... اور پھر تالیوں کی گونج میں ان کی تقریر



شاید اس دن بھی جھوک کی دیوی اس پر مہربان تھی اور اس کی آتما تن کے قید سے آزاد ہو گئی۔ گردھاری کی موت نے رحمت کو چھوڑ دیا تھا، کیونکہ نازو بھی اب ماں بننے والی تھی۔ — وہ جانتا تھا کہ پیٹ کے ایندھن میں کوئلہ ڈالنا بڑے جو کھم کا کام ہے اپنا اور نازو کا گذارا تو ہو جاتا تھا مگر اب ایک نئے جہان کی آمد سے وہ فکر مند رہنے لگا اس نے اپنے سارے ضروریات، سمیٹ لئے اور پانی پانی جمع کرنے لگا، اپنے بچے کے لئے۔

”بسیرا —“ کی چھٹی منزل کا آغاز ہوا اور اس نئے جہان نے گرج میں اپنا بسیرا لیا۔ منے کی پیدائش پر رحمت جھوم اٹھا۔ سارے مزدوروں میں وہ مٹھائی بانٹتا پھرتا رہا۔ وہ محسوس کرتا تھا کہ اب وہ ایک بڑی ذمہ داری سنبھالنے لگا ہے نازو جب اسے منے کے بابا کہہ کر بلاتی تو وہ خود کو بہت بڑا آدمی سمجھتا۔ گویا اس کا میکس کا مالک ہو۔ اس نے سوچ رکھا تھا کہ جب بسیرا مکمل ہو گئی ہو تو وہ اپنے لئے کوئی نہ کوئی مگرہ لے ہی لے گا۔ آخر چار سال خون اور پسینہ اسی مقام پر تو ٹپکا تھا۔ گرمی کے جھلسے لمحے، سردی کے ٹھڑتے دن اور بارش کی بھیگی راتیں اس نے اسی مقام پر تو گزاری تھیں۔ اس کا تو بہت حق تھا اس پر۔ اور پھر مٹا تو یہیں پیدا ہوا تھا جو جگہ پیدائش کی ہو وہ تو جائے عبادت ہے وہ اس کعبہ کو چھوڑ کر کہاں جاتا بھلا جس ماں کی کوکھ سے جنم لے اس کو کیسے بھول سکتا تھا وہ۔

وقت کو پرواز مل گئی، آخری منزل بھی مکمل ہو گئی مٹا پاؤں پاؤں چلنے لگا تھا کبھی پہلی منزل کبھی دوسری منزل گویا یہ اس کی ملکیت تھی۔ منے کو اس طرح گھومتا پھرتا دیکھ کر رحمت کہتا۔

”ارے چھوڑ دے اسے کیوں پکڑ رہی ہے، اسی کا ہی گھر ہے یہ تو۔ اسے حق ہے جہاں چاہے گھومے پھرے۔“ اور مٹا پھر ایک بار نظروں سے اوجھل ہو جاتا۔

اختتام کو پہنچی۔ رحمت کی تالیاں سب سے تیز تر تھیں۔ وہ ہجوم کو چیرتا ہوا آگے بڑھنے لگا، تاکہ منسٹر صاحب تک رسائی پاسکے اور اپنے لئے بسیرا مانگ سکے لیکن منسٹر صاحب کی کار اس جم غفیر کو چیرتی ہوئی نکل گئی اور وہ صرف دھول کو دیکھتا رہ گیا۔ ڈوبتے قدموں سے جب وہ اپنے گیرج کی طرف جانے لگا تب وہاں کے متعین گورکھ نے اُسے روک دیا۔

”بابو۔ اندرجانا منع ہے۔“ اس کے قدم ٹھٹھک کر رہ گئے۔

”مگر میری بیوی اور بچہ تو اندر ہیں۔“ وہ آگے بڑھنے لگا۔

”اندرونی نہیں یہ گیرج ہے۔ ملہوترہ صاحب کے نام پر بک کیا گیا ہے، تمہارا سامان اور بیوی بچے باہر ہیں۔“ گورکھ نے جواب دیا۔ اُسے یوں لگا جیسے اس کی بیوی اور بچہ کوئی انتہائی غیر اہم چیز ہیں، جسے باہر کر دینا بالکل معمولی سی بات ہو۔

”ارے واہ، یہ بھی خوب زبردستی ہے، ہم نے چار سال یہاں اپنا پسینہ ٹپکایا اور آج تم ہمیں اس طرح بے سہارا کر رہے ہو۔“ رحمت کو جوش آگیا۔

”دیکھو بابو۔ زیادہ ٹر ٹر مت کرو، ہمارا کام یہاں کی نگرانی کرنا ہے، سامنے سے ہٹ جاؤ، ملہوترہ صاحب کی گاڑی آرہی ہے۔“ گورکھ نے اس کا شانہ پکڑ کر دھکیلی دیا تبھی ایک فیت کار تیزی سے آکر گیرج میں رُک گئی، ملہوترہ صاحب کار سے اترے۔۔۔ گورکھ نے سلام بجالایا۔ ایک کھنکھتا سکہ انھوں نے گورکھ کی مٹھیلی پر رکھ دیا۔

”دشٹر بند کر دو۔“ اور اتنا کہہ کر وہ آگے بڑھ گئے، شٹر کے بند ہوتے ہی رحمت کو یوں لگا جیسے زندگی کے تمام راستے اس پر بند کر دیئے گئے ہیں۔ وہ مرے ہوئے قدموں سے گیٹ کے باہر نکل گیا، جہاں ناز و منا کو گود میں لئے کھڑی تھی۔ منے کا جسم بخار سے پھنک رہا تھا۔

”ایسی حالت میں ہم منا کو لے کر کہاں جائیں گے۔“ ناز نے پریشانی کے عالم میں کہا

”میں بھی یہی سوچ رہا ہوں۔“ اور پھر ایک بار رحمت امید کا دامن تھامے

بسیرا کی گیٹ پر پہنچا۔

”بھیا۔ میرا بچہ بیمار ہے ہمیں کہیں سر چھپانے جگہ نہیں، اس کڑا کے کی سردی میں ہم کہاں جائیں گے۔ آج ایک رات ہم کو پناہ لینے دو۔“

”میں نے کہہ دیا نا تنگ نہ کرو۔ دیکھو ہم اس کا مپلکس کا باڈی کارڈ ہے، ہمارا کام اس کی حفاظت کرنا ہے ہم تم کو اس کے اندر کیسے آنے دے گا۔“ گورکھ نے سمجھانے کی کوشش کی۔

”بھیا۔ جس بلڈنگ کی تم حفاظت کر رہے ہو آج اس کے بنانے والے محفوظ نہیں، جن ہاتھوں نے سب کو پناہ دی آج وہی پناہ کی تلاش میں ہیں، جس بسیرے کو ہم نے بنایا وہی آج بے آسرا ہیں۔ جس چیز کی حفاظت کے لئے گرج بنے ہیں وہ تو لوہے کی بنی ہے مگر جن ہاتھوں نے یہ حفاظت گاہیں اور پناہ گاہیں بنائی ہیں وہ ہاتھ آج آسرا مانگ رہے ہیں۔ کیسی دنیا ہے، جہاں بے جان چیزوں کے لئے ٹھکانہ تو موجود ہے مگر جان دار کے لئے کھلے چھت اور زمین کے سوا کچھ نہیں۔“ وہ مایوس لوٹ آیا۔

”نازو، ہم غریبوں کے لئے یہی زمین فرش اور یہی آسمان چھت ہے۔ یہی ہمارا ٹھکانہ ہے اور یہی ہمارا بسیرا ہے۔ پھر اس نے ایک چادر فٹ پاتھ پر بچھا کر منا کو لٹا دیا۔

رات آہستہ آہستہ بھینگنے لگی، بسیرا کی گیٹ پر پڑا، بڑا سا تالا، اس کی زندگی کا مذاق اڑا رہا تھا۔ جانے وہ کب تک اسی طرح بیٹھا بسیرا کی پر شکوہ عمارت کو ٹکٹا رہا۔ صبح کی اولین ساعتوں میں جب بسیرا کا آہنی چھانٹک کھلا تو اس کی نیند بھی کھل گئی۔ اس نے فوراً ہی منے کے جسم کو دیکھا۔ برف کی سل کی طرح اس کا جسم ٹھنڈا تھا بجلی

ہا سا دندا اس کی آنکھوں کے آگے لپک گیا، اس نے منا کو ہلا کر دیکھا مگر وہ بربر کے گڈے کی طرح اگر طر سخت ہو چکا تھا۔ اب اس کو سب کچھ سمجھ میں آ گیا، گویا بسیرا نے ایک اور ننھی جان کی قربانی بھی لے لی تھی۔

ناز و کمی چینوں سے ماحول لرز نے لگا، رحمت منا کی لاش کو دونوں ہاتھوں پر اٹھائے بسیرا کی پُر شکوہ عمارت کو دیکھ رہا تھا، اس کی آنکھوں میں آنسو تھے، یہ نفرت کے تھے یا غم کے اسے کوئی نہ جان سکا، البتہ بسیرا سے نکلنے والا ہر مکین چند سکے زمین پر بھی ہوئی چادر پر ڈال رہا تھا، اور گزر رہا تھا، شاید یہی رحمت کی محنت کا ثمرہ تھا۔

# گھونگھٹ کی آنچ

ڈھولک کی تھاپ تیز ہو گئی تھی۔ فضا میں بابل کے درد بھرے گیتوں سے دھواں اُٹھنے لگا تھا۔ لڑکیاں لہکتی آوازوں میں گارہی تھیں۔

اپنے بابل سے بچھڑ کے  
گھر کا آنگن سونا کر کے

گوری کہاں چلی گھونگھٹ میں چاند چھپائے۔ . . . .

دلہن کو سنگھار کر کے مسند پر بٹھایا گیا تھا۔ آرسی مصحف کی رسم ہونے کو تھی، دلہا باہر سے پھولوں سے لدا پھندا اندر آیا۔ ایک ہنگامہ سا چم گیا، بچے بوڑھے جوان سبھی نے دلہا دلہن کے گرد ہالہ سا بنا لیا۔ صبا بھی گلابی چم چلتے غرارے کے پائیتھے سنبھالتی آگے بڑھی۔ دلہے کی بہن نے دلہا دلہن کے سروں پر سرخ جھلملاتا دوپٹہ ڈالا اور درمیان میں شفاف آئینہ رکھ کر رُونمائی کی رسم انجام دی۔ صبا پورے اشتیاق سے یہ سب کچھ دیکھتی رہی۔ دلہا نے دلہن کو انگوٹھی پہنادی جھلملاتا دوپٹہ اتار لیا گیا لیکن صبا پتھر کا بت بنی نہ جانے تصور میں کیا کیا دیکھتی رہی یہاں تک کہ دلہن رخصت ہو گئی۔ باجے کے شور و غل سے ماحول بھی تھرا رہا تھا۔ کچھ دیر وہ سیڑھیوں پر کھڑی

رہی، پھر نہ جانے کیا سوچ کر کمرے میں آگئی۔ اس نے اپنا گلابی دوپٹہ اوڑھ لیا اور اسے گھونگھٹ کی طرح تھوڑا سا آگے کھینچ لیا۔ وہ آنکھیں بند کئے کھڑی رہی۔ کسی نے اس کا دوپٹہ آہستہ سے اٹھایا۔ اس نے گھبرا کر آنکھیں کھول دیں۔

”لیجئے یہ ہم آپ کو رونمائی میں دیتے ہیں۔“ احمر نے جوہی کے سفید پھولوں کا گجرا اس کے ہاتھ میں پہناتے ہوئے کہا۔

”آپ..... آ..... آپ.....“ وہ بدحواس ہو گئی۔

”جی.....“ اس نے سر جھٹکایا۔

”کک..... کسی نے..... دیکھ لیا تو“ وہ سہم گئی۔

”وہاں سارے لوگ دلہن کو رخصت کر رہے ہیں۔ یہاں یہ دلہن ہماری منظر تھی۔ اس لیے ہم چلے آئے۔“ احمر کی نگاہوں میں شرارت تھی۔

”ہائے اللہ..... کتنے وہ ہیں آپ.....!! اور وہ شرم سے بل کھا کر جھانک گئی۔

”اری چپ رہ تو تو بنتی ہے۔ بھیا نے خود کہا کہ وہ تیری رونمائی دے چکے ہیں“ فوزیہ نے صبا کو چٹکی لے کر کہا۔

”ہائے اللہ۔ کیسی باتیں کرتی ہے تو کسی نے سن لیا تو غضب ہو جائے گا۔“ وہ سہمی آواز میں کہہ رہی تھی۔

”ہائے میری بنو۔ دل تو دھک دھک کر رہا ہے، مارے خوشی کے اور ہمارے سامنے ایکٹنگ کرتی ہے۔“ فوزیہ ستانے پر تکی تھی۔

”قسم لے لے جو میں نے انھیں بلایا۔ میں تو یونہی اکیلی کمرے میں تھی کہ وہ اچانک چلے آئے کسی بلا کی طرح۔“ وہ صفائی پیش کر رہی تھی۔

”اچھا بابا جانے دو، اب مجھے اس بلا کو تیرے ہی سر منڈھنا ہے۔ سمجھی!“

اور فوزیہ صبا کے دل میں جگمگ کرنے کے لیے ایک ستارہ چھوڑ گئی۔

صبا جانتی تھی کہ ابھی مہندی کے گل بوٹے اس کے نصیب میں نہیں ہیں۔ وہ اپنے بابا کی حالت سے خوب واقف تھی۔ دولت کی فراوانی عیش و نشاط کو دعوت دیتی ہے۔ آباد اجداد کی جائداد اور پیسے کا غلط استعمال کرنا ان کا روزمرہ کا اصول تھا۔ خیر سے تین شادیاں تو کر ہی چکے تھے۔ صبا کی اپنی امی کے مرنے کے بعد سے دو دہنوں کو زیور سے آراستہ دیکھا جن سے ملاتے ہوئے اس کے بابا نے کہا تھا۔

”یہ تمہاری نئی امی ہیں۔“ اس کا ذہن تب معصوم تھا وہ سوچتی تھی کیا ہر ایک کو نئی ماں \_\_\_\_\_ ؟ ننھا ذہن اس سوال کا جواب تو نہ دے سکتا تھا لیکن اس نے یہ مفروضہ محسوس کیا تھا کہ نئی ماں پیار کے بدلے جھگرتی ہے تب اسے لفظ ماں سے نفرت سی ہو گئی تھی۔

شراب و شباب نواب حشمت خاں کی آن بان کا مظہر تھے۔ دولت چاہے کتنی ہی مدفون کیوں ہو خرچ کی جائے تو ختم ہو ہی جاتی ہے جیسے کسی کرتے کا کوئی ٹانکا کھل جائے تو سارے کا سارا کرۂ آہستہ آہستہ ہی کھل جاتا ہے۔ اپنی اکلوتی لڑکی کے مستقبل کو انھوں نے زبانی باتوں، تصوراتی خاکوں، تخیلاتی حسن سے سنوارنے کی کوشش کی یہ سب ان کا دھوکا تھا۔ زندگی کے لمحے تیزی سے گزرتے رہے۔ اور وہ پرانی وضع واری پر اٹل رہے۔ صبا شعور کی منزل کی طرف بڑھ رہی تھی۔ اس نے جب سے ہوش سنبھالا تھا۔ گھر میں اکثر دھولک کی تھاپ، پازیب کی جھنک، چوڑیوں کی کھنک عروسی جوڑے کی جھلملاہٹ عود و عنبر کی خوشبو برقی قمقموں کی جگمگاہٹ اور پھولوں کی سیج دیکھی تھی لیکن یہ سب اس کی نئی امی کے لئے ہوتا رہ گئی رہی۔ ایک دو تین چار پارچے ..... اب اسے ان تمام چیزوں سے جیسے گھن سی آگئی۔ اپنے بابا کا یہ شوق اسے بہت بُرا لگنے لگا مگر مجال نہ تھی کہ وہ مشورہ بھی دے سکے۔

وہ سارا دن اپنے کمرے میں بند پڑی رہتی۔ کھانا وقت پر آجاتا دو لقمے زہر مار کرتی

کبھی ناول کبھی پچھر کبھی باغ کی سیر اور کبھی فوزیہ کے گھر۔ وہ اکثر اپنے پلنگ پر پڑی اپنے بارے میں سوچتی رہتی۔ سرخ جھلملاتا گھونگھٹ اس کے حواس پر چھایا رہتا۔ احمر کی شوخ نظروں کا تصور کر کے وہ آپ ہی آپ شرمایا جاتی۔ آج جب فوزیہ نے احمر سے اس کے رشتے کی بات چھیڑی تو جیسے کنول کی بند کلی جاگ اٹھی۔ وہ مسرت کے دوش پر سوار ہو گئی، وہ دروازے کی اوٹ سے جھانکتے ہوئے فوزیہ کی باتیں سن رہی تھی، جو وہ اس کے بابا سے کر رہی تھی۔

”چچا جان! مٹی کی یہ بڑی آرزو ہے کہ صبا ہمارے گھر بہو بن کر آئے۔ مجھے امید ہے کہ آپ اس رشتے کو ضرور قبول کریں گے۔“

”بیٹی فوزیہ۔ رشتے سے مجھے انکار نہیں میں اسے دل سے قبول کرتا ہوں لیکن ابھی صبا کی عمر یہ کیا ہے۔ اور پھر احمر اعلیٰ تعلیم کے لئے باہر بھی تو جا رہا ہے۔ وہ تعلیم ختم کر کے آجائے تو پھر یہ کام انجام دیں۔“

نواب حشمت خاں نے بڑی وضع داری اور وقار سے کہا:

”مگر چاچا جان! کتنا اچھا ہوتا اگر شادی ہو جاتی اور دونوں ساتھ ہی باہر چلے جاتے۔ فوزیہ نے کہا:

”ایسی بھی کیا جلدی ہے ابھی صبا کی عمر بہت کم ہے اسے شعور تو آجانے دو، ہم زبان کے پابند ہیں۔ صبا تمہاری رہے گی بس ٹھیک ہے نا! نواب صاحب نے بات ختم کر دی۔

”جی بہتر“، کہہ کر اٹھ کھڑی ہوئی، صبا دروازے کے پاس ہی اسے مل گئی۔

”دیکھ لے گڑیا تیرے بابا تجھے اب بھی سمجھتے ہیں۔ جب تو سمجھ دار ہو جائے گی تبھی تیرے ہاتھ پیلے ہوں گے۔“

فوزیہ نے اسے چھیڑ کر کہا۔ وہ چپ ہو گئی۔ فوزیہ کے جاتے ہی وہ آئینے کے سامنے آکھڑی ہوئی۔ اس نے دیکھا اس کی آنکھوں میں ستاروں سی چمک رہے گلوں



پر شفق ابھر آئی ہے، ہونٹوں پر شراب چل رہی ہے، جبیں عرق آلود ہو رہی ہے۔ زلفیں ناگہانی کسی کو ڈسنے کا انتظار کر رہی ہیں آبرو و خجھر کی طرح چمک رہے ہیں۔ پلکوں کی چلیں بار حیا سے جھمک رہی ہے۔ سانسوں کا زیر و بم تیز تر ہو گیا ہے۔ دل کی دھڑکن میں عجیب سی اضطرابی کیفیت محسوس ہو رہی ہے۔ سر سے قدم تک وہ جھلکتی ہوئی مٹے۔ بل کھاتا ہوا دریا۔ بہتا ہوا جھرنہ، انگرانی لیتی ہوئی سورج کی پہلی کرن۔ چودھویں کا پورا چاند نظر آ رہی تھی۔

”کیا میں بچی ہوں۔؟ میری عمر ابھی اس قابل نہیں کہ میں جھللاتے آنچل کی آرزو کروں۔“ وہ خود سے سوال کرتی رہی لیکن کسی نے جواب دیا۔ بہت دیر تک کمرے میں سکوت رہا، پھر اس سکوت کو چھیرتی نواب صاحب کی آواز آئی۔

”جمن! ہمارے کمرے کو آراستہ کر دینا۔ دیوان خانہ سجا دینا، قاضی صاحب کو وقت پر آنے کہہ دینا۔ آج تمہاری نئی مالکن آئیں گی۔“ ان جملوں پر اسے پہلی بار نفرت سی محسوس ہوئی۔

”کیا یہ عمر اس قابل ہے کہ سہارے کی ضرورت ہو۔؟ وہ نفرت سے گردن جھٹک کر اپنے پلنگ پر گر پڑی۔ تنیکے کو نیچے رکھے جوہی کے گجرے کو اُس نے نکالا، پھول تو مرجھا چکے تھے۔ خوشبو باقی تھی، اور وہ دھاگا جس میں پھول پروئے گئے تھے، اب بھی مضبوط تھا۔ وہ تصور کے اڑن کھٹولے پر اڑنے لگی۔

احمر جا چکا تھا۔ صبا انتظار کی صلیب پر جھومتی رہی۔ سورج ڈوبتا ابھرتا رہا۔ چاند مستیاں بکھیرتا رہا۔ ستارے سرگوشیاں کرتے رہے اور وقت بگولے کی طرح اڑنے لگا۔ نواب حشمت خاں کی آن بان میں فرق نہ آ سکا۔ دولت پھرتے مٹکے کی طرح ختم ہو رہی تھی اور وہ اپنی رنگینیوں میں کھوے ہوئے تھے۔ صبا کو گھونگھٹ کی تلاش تھی لیکن اس کے گھر میں نئی ماں کی تعداد میں اضافہ ہی ہوتا رہا۔ باپ کی شفقت سے وہ بہت دور تھی۔

کبھی کبھار وہ اگر اظہار محبت کرتے تو صبا محسوس کرتی یہ دکھاوا ہے، ڈھونگ ہے۔  
 کانٹوں کی سیج پر اس نے یہ دن گزارے اس کا ہر لمحہ بہار کو خزاں، اُجالے کو  
 تاریکی سمجھ کر گزارا رہا۔ نواب صاحب کی حشمت جا رہی تھی۔ دولت ختم ہوئی، اور قرض نے  
 دروازے پر دستک دی۔ ساہوکاروں نے منہ کھولا۔ قرض داروں نے تقاضا کیا، مجبوراً  
 ”شادولا“ نیلام چڑھ گیا۔ کرائے کے گھر میں رہنے کے باوجود نواب صاحب کا ٹوٹا ہوا  
 وقار ابھی چمپ رہا تھا۔ صبا مقامی اسکول میں ٹیچر ہو گئی آمدنی کا پورا حصہ باپ کے قدموں  
 میں ڈال کر صرف چھ روپے وہ بچاتی رہی۔ چھ سال پورے ہوئے اپنی کمائی کے کل ۱۲۲  
 روپے اس کے پاس موجود تھے۔ بہت دیر تک وہ سوچتی رہی کہ ان روپیوں کو کس کام  
 میں لایا جائے۔ تبھی فوزیہ نے اطلاع دی کہ احمر آ رہا ہے۔ سرخ گھونگھٹ اس کی نگاہوں  
 کے آگے چل گیا اس نے بازار سے گھونگھٹ خرید ہی لیا۔ اندر سے مکرہ بند کر کے گھونگھٹ  
 چہرے پر ڈال لیا۔ بہت دیر تک آنکھیں بند کئے وہ احمر کا تصور کرتی رہی۔ پھولوں میں  
 لدا پھندا وہ چلا آ رہا تھا قریب آ کر اس نے گھونگھٹ الٹ دیا مگر — یہ تو  
 اس کا تصور تھا۔ کمرے میں دور دور تک کسی کا پتہ نہیں تھا۔ وہ تھی اور آئینے میں اُس کا  
 عکس۔ اسی وقت کسی کی آواز اُس نے سنی۔ اس آواز کا انتظار اس نے چھ سال سے  
 کیا تھا وہ دوڑتی ہوئی باہر آئی۔ لیکن حیا نے اور کچھ باپ کی موجودگی نے قدم پکڑ لیے۔  
 وہ پروے سے جھانکنے لگی۔ کتنے حسین ہو گئے ہیں۔ وہ ہائے اللہ۔ آنکھوں میں تو  
 ابھی وہی شونہ ہے، روپ تو یوں نکھرا ہے جیسے چاندنی میں نہا کر آئے ہوں۔ بالوں  
 کی دلکشی اب بھی ویسی کی ویسی ہے۔ ہونٹوں پر شریر مسکراہٹ اب بھی کھیل رہی  
 ہے وہ نظروں سے بلائیں لینے لگی۔  
 ”بڑی خوشی کی بات ہے کہ تم بخیر و عافیت واپس آ گئے۔“ نواب صاحب  
 کہہ رہے تھے۔

”مجھے خود صبا کی فکر ہے لیکن شادی کے لئے تمہیں انتظار کرنا ہو گا۔ تم تو جانتے ہو ہم بڑی آن بان والے ہیں۔ اپنی اکلوتی بیٹی کی شادی ایسی ویسی نہ ہونے دیں گے۔ اس کی ماں جس دھوم دھام سے دولت میں تلتی ہوئی یہاں آئی تھی ہم اسے بھی ویسے ہی رخصت کریں گے اس کے لئے وقت چاہیے۔ ہم کوشش میں ہیں۔ ہم نے زبان سے کہہ دیا صبا تمہاری ہے۔ وہ تمہارے لئے ہی رہے گی۔ اگر اسے پانا چاہتے ہو تو انتظار کرو۔“

شان و شوکت کی یہ رسی جل کر ختم ہو چکی تھی مگر بل ابھی باقی تھا۔ صبا دیوار سے سرٹیک کر سوچنے لگی انتظار کا لفظ کس نے اور کیوں ایجاد کیا۔۔۔ احمر چلا گیا۔ صبا نے سرخ گھونگھٹ کپڑوں کی تہہ میں چھپا دیا۔ وقت کسی بیمار کے سانسوں کی طرح چل رہا تھا صبا میں اتنی ہمت نہ تھی کہ وہ خود اپنے باپ سے کہہ دے مجھے کچھ نہ چاہیے بس سرخ گھونگھٹ اوڑھا کر مجھے رخصت کر دیں۔

نواب صاحب اب کھلے بندوں نہیں چوری چھپے شراب و شباب کی رنگینیاں سمیٹتے۔ صبا ان کی نظروں میں ابھی ”بچی“ تھی جس کی شادی کی کوئی جلدی نہ تھی صبا نے اپنے بارے میں سوچنا چھوڑ دیا، لیکن سرخ گھونگھٹ اس کی نگاہوں میں مچلتا ہی رہا جوہی کے سوکھے گجرے کو جس کی پتیاں جھڑ چکیں تھیں لیکن وہاں باقی تھا وہ اب بھی سوگھتی رہی۔ دن گذرتے رہے لیکن اس نے دیکھا ابھی گھر میں اس کے جہیز کی کوئی چیز نہ آئی۔ نہ زیور نہ کپڑا، نہ فرنیچر۔ اس کا کون شریک تھا، کون رازدار تھا جس سے وہ پوچھ سکے، اپنے گھر میں وہ اجنبی تھی۔ نواب صاحب والاں میں مصاحبوں کے ساتھ رہتے۔ نوکر کام میں رہتے جو نئی ماں آئی وہ اپنے کمرے میں ہی رہتی۔ نواب صاحب نے اب صبا سے نئی ماں کا تعارف کروانا چھوڑ دیا تھا۔

ایک دن جب وہ اسکول سے گھر آئی تو اُس نے دیکھا ایک گلابی لٹافہ نواب صاحب کے ہاتھ میں تھا اور وہ پریشان ٹہل رہے تھے۔ وہ کسی انجانے خوف سے سہمی سہمی اندر

آئی۔ ”صبا اس کم ظرف نے ہمارا مذاق اڑایا ہے۔ لیکن ہم بھی اس کا بدلہ لے کر رہیں گے تم فکر نہ کرنا۔“ نواب صاحب نے کہا اور لفافہ اس کے آگے پھینک دیا۔ وہ لفافہ لے کر اندر چلی آئی، کمرہ بند کیا اور دھڑکتے دل سے اسے کھولا یہ احمر کی شادی کا دعوت نامہ تھا اور اس میں ایک خط بھی تھا جس میں تحریر تھا۔

”میں مزید انتظار نہیں کر سکتا۔ جی بیمار ہیں۔ ان کا دل رکھنے کے لئے میں اپنی خالہ زاد بہن سے شادی کر رہا ہوں، اپنی ماں کو میں دکھ نہیں دے سکتا ہو سکے تو مجھے معاف کر دیں۔“

صبا کی آنکھوں کے سامنے جیسے بجلی سی کوند گئی، چوڑیاں ٹوٹی نظر آئیں۔ سنگھار اجڑتا نظر آیا سرخ گھونگھٹ میں آگ لگ گئی اور وہ انتظار کی صلیب پر زندگی کے آخری لمحے گننے لگی۔

اس واقعہ کو دو سال گزر گئے۔ احمر اپنی دلہن کے ساتھ واپس چلا گیا نواب صاحب کی آنکھیں کھل رہی تھیں۔ آہستہ آہستہ جہیز جمع ہو رہا تھا لیکن وہ بت بن گئی۔ آنکھیں ویران ہو گئیں لب سوکھ گئے، چہرہ اداسی کی سیاہی میں ڈوبنے لگا۔ گال زرد پڑ گئے، اور زلفوں میں چاندنی بکھر نے لگی۔ اپنی لٹنی ہوئی عزت کو جمع کر کے نواب صاحب نے مختصر سا سامان تیار کر لیا اور صبا کے لئے ایک کلرک کا رشتہ منظور کر ہی لیا۔

”صبا سب کچھ جان کر بھی چپ تھی، نواب صاحب کے پیش نظر انتقام تھا، اپنی بے عزتی کا بدلہ تھا۔ اس رات وہ طیش میں کئی جام چڑھا گئے، نشے نے تلخ یادیں تو جھلا دیں لیکن ان کی نگاہوں میں پھولوں کی سیج پھر ایک بار آگئی انھوں نے جن کو آواز دی۔

”جن میرے میں سیج سجا دینا میں نئی مالکن کو لے آ رہا ہوں۔“

لڑکھڑاتے قدموں سے وہ باہر نکل گئے۔ صبا نے یہ سب کچھ سن لیا۔ ایک سگڑا

اس کے روکھے لبوں پر پھیل گئی وہ طنزیتھی یا تلخ یا پُر مسرت۔ اسے کوئی دیکھ نہ سکا۔ بہت رات گئے نواب صاحب لوٹے۔ نشے سے سرشار ایک نئی نوپلی دلہن کے ساتھ وہ اپنی خواب گاہ کے دروازے پر پہنچے۔

”دیکھو ہم نے تمہارے لئے کتنی شاندار سیج سجائی ہے۔“ یہ کہہ کر انھوں نے دروازہ کھول دیا۔ جیسے ہی دروازہ کھلا ان کی نگاہوں میں بجلی سی چمک گئی۔ سارا نشہ کا فور ہو گیا۔ وہ اندر پہنچے۔ پھولوں کی سیج پر ایک اور دلہن محو خواب تھی سرخ گھونگھٹ چہرے پر ڈالے۔ انھوں نے تیزی سے گھونگھٹ الٹ دیا۔

”صبا ————— میری بچی —————“ ان کی زبان سے چیخ نکلی گئی۔  
 ”تم..... تم یہاں لگ..... کیوں آگئیں۔۔۔۔۔؟“ انھوں نے اس کے شانے کو جھنجھوڑ کر کہا لیکن گھونگھٹ میں منہ چھپائے ہوئے دلہن کی گردن شرم سے ڈھلک گئی اس کی کھلی ہوئی آنکھوں میں انتظار تھا مرجھائے ہوئے لب و رخسار سر اپا سوال تھے۔ اس کی ہنسی میں ایک خط تھا۔

بابا! اس گستاخی کی معافی چاہتی ہوں۔ زندگی کی اٹھائیس برس گزارنے کے بعد نہ جانے کیوں میں بے اختیار ہو گئی۔ یہ سرخ گھونگھٹ جسے میں نے اوڑھ رکھا ہے، برسوں سے میرا قاتل بن گیا۔ نہ جانے اس میں کیا بات تھی جس نے مجھے دیوانہ بنا دیا۔ ہرپل ہر لمحہ اسے اوڑھنے کی آرزو دل میں مچلتی رہی۔ میری پلکوں پر مچلنے والا خوابِ شرمندہ تعبیر نہ ہو سکا۔ احمر سے آپ نے وعدہ کیا تھا کہ صبا تمہاری ہے اور تمہاری ہی رہے گی۔

کیا تھا نا بابا.....!! اسی وعدے کی لاج نبھا رہی ہوں، احمر نے اپنی ماں کا دل رکھنے کے لئے انتظار کا آشیانہ پھونک ڈالا۔ کیا۔ مجھ پر واجب نہیں کہ میں اپنے باپ کے وعدے کا پاس رکھوں۔ میں یقیناً احمر کی ہوں اور احمر کی رہوں گی۔

آپ کے اس وعدے کو پورا کرتے ہوئے میں اپنی زندگی کے دیرینہ خواہش کی تکمیل پر  
مجبور ہو گئی۔

پھولوں کی سیج اور سُرخ گھونگھٹ کی تمنا بیج بن کر پھیل گئی۔

میں جانتی ہوں یہ سیج میری نئی ماں کی ہے لیکن میرے دل نے مجھے بے قابو کر دیا  
اور میں اس گستاخی کی جرأت کر بیٹھی۔

میں نے زہر تو کھالیا کیونکہ اس گستاخی کی یہی سزا تھی، خدا را مجھے معاف  
کر دیجئے اور ہاں اگر ہو سکے تو مجھے اسی سُرخ گھونگھٹ سے سجا کر میری آخری آرام گاہ  
تک پہنچا دیں۔

معافی کی طلب گار

صبّیا

نواب حشمت خاں کے ہاتھ سے کاغذ چھوٹ گیا۔ دالان میں رکھے پنجرے کی  
مقید بلبل پھر سی اڑ چکی تھی۔ فضا اس کے درد بھرے نغموں سے اُداسی میں  
ڈوب گئی۔

## ہو کے رنگ

اس نے گھر میں آئے اسے صرف چار ہی دن ہوئے تھے، وہ کمروں کی آراستگی میں مصروف تھی۔ آفاق نے کمپنی سے مکان کی تلاش کے لئے باقاعدہ چھٹی لے رکھی تھی، پندرہ دن کی ان تھک کوششوں کے بعد مسز خان کو یہ مکان مل سکا تھا۔ ویسے جو مکان اسے کمپنی سے الاٹ ہوا تھا وہ شہر سے دور تھا۔ یہاں خاموشی اور سناٹے کا راج تھا، دور دور تک پھیلی ہوئی خاموشی انجم کی زندگی کے راز کھول رہی تھی۔ اس کی اپنی زندگی بھی تو ایسی ہی ویران ویران ہی تھی۔ شادی کے دس سال بعد ہی اس کی گود سونی ہی تھی، جیسے کوئی بنجر دھرتی، جیسے کوئی خالی کنواں، جیسے کوئی سوکھا درخت۔ گھر کا کونہ کونہ وہ سلیقے سے آراستہ کرتی مگر اسے محسوس ہوتا جیسے کچھ کمی سی رہ گئی ہو، جیسے باغ ہو بہار نہ ہو، پھول ہو خوشبو نہ ہو۔ پیما نہ ہو بادہ نہ ہو، آنکھ ہو کاجل نہ ہو۔ دل ہو دھڑکن نہ ہو۔ چشم ہو نور نہ ہو، جسم ہو اور جان نہ ہو۔ کتنا اکیلا محسوس کرتی وہ خود کو ——— لاکھ مصروفیت سہی دکھ تو دبے پاؤں کہیں نہ کہیں سے چلا ہی آتا ہے کہ رقص کرتی زندگی کو ساکت کر دے۔ وہ بظاہر خوش رہتی مگر دل کے نہاں خانے میں غم کا آلاؤ ہمیشہ سلگتا ہی رہتا۔

آفاق نے بڑی کوشش کی کہ وہ زندگی کی اس محرومی کو محسوس نہ کرے زخم کو ناسور نہ بنائے مگر وہ ناکام رہا۔ اس کی وارفتگی میں کوئی کمی نہ آئی اس کا دیوانہ پن باقی رہا۔ تنہائی میں وہ سپنے دیکھتی۔ بادلوں کے پار سے گول مٹول ننھے کو اترنا دیکھتی اسے پالنے میں جھلاتی لوریاں گاتی۔ جب وہ پاؤں پاؤں چلنے لگتا تو اس کے ساتھ آنکھ مچولی کھلتی، ایسے ہی موقع پر آفاق چلا آتا۔ اس کی یہ وارفتگی دیکھتا تو مایوسی کے گھپ اندھیرے میں ڈوب جاتا۔ اس کا بس چلتا تو انجم کی یہ خوشی وہ کہیں سے ادھار لے لیتا مگر.....

آخر کار اس نے مسز خان کا یہ فلیٹ اسی لئے لیا کہ انجم یہاں پہلی ہے۔ آج آفاق کے جانے کے بعد جب انجم کمرے کی صفائی کر رہی تھی تو ایک کوئل کی کوک فضا میں گونج اٹھی۔

”آنٹی۔۔۔ آنٹی“ اس نے مڑ کر دیکھا تو دروازے میں چار سال کے ایک بے حد معصوم چہرے والی پیاری سی لڑکی کھڑی تھی۔ سفید فراک میں ملبوس وہ کوئی جاپانی گڑیا لگ رہی تھی۔

”آنٹی ہم اندر آئیں۔“ اس نے پھر ساز بجا یا۔

”آؤ آؤ“ انجم خواب سے بیدار ہوئی۔

”آپ ہماری نئی آنٹی ہیں نا!“ اس نے اپنی آنکھیں گھا کر پوچھا۔

”ہاں ہاں، لیکن تمہیں کس نے بتایا۔“ انجم نے سوال کیا۔

”ان کمروں میں جو بھی آتا ہے ہم انھیں آنٹی اور انکل ہی کہتے ہیں۔ آپ نہیں جانتیں میں جو ہی ہوں، نیچے ہی تو میرا گھر ہے۔“ اس نے اپنا تعارف کروایا۔

”جو ہی۔۔۔!! اچھا تو اسی لئے ہنستے پھرتی ہو۔“ انجم نے پوچھا۔

”لیکن می تو کہتی ہیں کہ میں سب کو تنگ کرتی ہوں، دیکھئے میں تو آپ سے ملنے



چلی آئی۔

”بہت اچھا کیا، بڑی پیاری باتیں کرتی ہو تم تو۔“ انجم نے اس کے کال پر چٹی

بھرتے ہوئے کہا۔

”آپ کو میری باتیں اچھی لگتی ہیں تو میں آپ سے بار بار باتیں کرتی رہوں گی۔“  
اور پھر یہ سلسلہ چل پڑا۔ وہ پہروں باتیں کرتی اور انجم چپ چاپ سنتی رہتی جات  
کا یہ رنگ دن بدن نکھرنا گیا۔ انجم کے دل کی دھڑکن جوہی کے لئے وقف ہو گئی۔ اور جوہی کا  
پیار انجم کے حصے میں آیا۔ مسز خان کی جوہی اب رات دن انجم کی بانہوں میں جھولنے لگی۔  
آفاق کو سکون مل گیا، جس درد کی دوا کا وہ متلاشی تھی، جوہی کی شکل میں وہ اس کے  
سامنے تھی۔ سمندر اور بوند کا یہ سنگم سیپ اور موتی کا یہ لمن، ڈالی اور کلی کا یہ رشتہ،  
ممتا اور محصومیت کا یہ دل نشین ملاپ قدرت کا انوکھا کرشمہ تھا۔

مسافر وقت تیزی سے قدم بڑھاتا رہا، چاہت کا بیج محبت کے پودے میں  
تبدیل ہو کر وارفتگی اور سپردگی کے پھولوں سے بھر چکا تھا۔ جوہی آنکھ کھولتی تو انجم  
کی گود میں۔ انجم سانس لیتی تو جوہی کو دیکھ کر۔ مسز خان محسوس کر رہی تھی کہ ان کے  
آنکھن کا گلاب انجم کے گلہ ان کی زینت بن رہا ہے۔ اس دن تو وہ صبح چرخ خار ہی کھا  
گئی، جب جوہی نے ان کے ساتھ اپنی خالاک شادی میں دہلی جانے سے انکار کرتے  
ہوئے انجم کے پاس رہنا گوارا کر لیا۔ مسز خان نے لاکھ سمجھایا پروہ مانی نہیں بچل ہی  
گئی۔ معصوم صورت فریادی بن گئی۔ ملتی نگاہوں سے اس نے انجم کو دیکھا، انجم کہ اچھی  
”جوہی کو چھوڑ دیجئے وہ مجھے اپنی جان سے بھی زیادہ عزیز ہے، میں اُسے خود  
سے ایک پل کے لئے بھی الگ نہ کروں گی۔ میری دھڑکن مجھ سے دور ہو سکتی ہے۔ میری  
نفس تم سم سکتی ہے مگر جوہی میرا سایہ بن کر ہر پل میرے ساتھ رہے گی۔“

مسز خان مجبور ہو کر چلی گئیں۔ جوہی انجم اور آفاق کی نگاہوں کا سرمہ بن گئی۔ دو

دن تو آرام سے گزر گئے، لیکن تیسرے دن آنکھ مچولی کھیلنے کھیلنے جوہی سیر مٹھیوں پر سے پھسل کر گر پڑی۔ انجم کی روح گھائل ہوئی اور آفاق درد سے کراہ اٹھا۔ خون میں لت پت جوہی کو ہسپتال لے جایا گیا وہاں اس کے سر کو ٹانگے دیئے گئے اور خون کی ضرورت درپیش ہوئی۔ انجم کا بلڈ گروپ جیسے جوہی کے لئے ہی تھا۔ وہ خون دینے تیار ہو گئی۔ انجم کا خون بوتل کے سہارے جوہی کے جسم میں دوڑنے لگا۔ انجم محسوس کر رہی تھی جیسے وہ ماں بن گئی ہو اور خون کی شکل میں اس کا دودھ جوہی کے حلق کو تر کر رہا تھا۔

اس نے محسوس کیا کہ آج وہ بنجر دھرتی نہیں بلکہ زرخیز زمین بن گئی ہو۔ اُس نے جانا کہ وہ تخلیق کے کرب سے آشنا ہو چکی ہے۔ اب وہ ایک ایسی ہستی بن گئی ہے، جسے ماں کہا جاتا ہے۔ وہ اس نام کے تقدس اور آفاقیت میں ڈوب گئی۔

ماں — وہ عظیم ہستی جس کے وجود سے دنیا میں پاکیزگی کا جلوہ ہے جس کے قدموں پر بادشاہ اور فقیر دونوں ہی کے سر جھکتے ہیں جس کی آنکھوں میں چھپے ہر دوا کی چمک سے قائل بھی کانپ جاتا ہے جس کے دستِ شفقت کے سایے میں گناہ گار بھی پناہ لیتا ہے، یہ سوچ کر انجم کو سکون قلبی مل گیا۔

جوہی ٹھیک ہو کر گھر آنے کے چار دن بعد ہی مسز خاں دہلی سے واپس آ گئیں۔ انجم کا دل ایک انجانے خوف سے دھڑک اٹھا۔ جوہی کے سر کا زخم اور کمر و چہرہ مسز خاں سے پوشیدہ نہ رہ سکا۔ ان کی تیز نظروں نے ایک پل میں سب کچھ بھانپ لیا وہ سیدھے انجم کے کمرے میں چلی آئیں، جوہی اس سے لیٹ کر سو رہی تھی۔ ایک جھٹکے سے انھوں نے جوہی کو انجم سے الگ کر دیا۔ جیسے تنکے تنکے جوڑ کر بنائے گئے آئینے پر برق گر پڑی ہو۔ جیسے کنارے کو لگتی ہوئی کشتی طوفاں میں ڈوب گئی ہو۔ جیسے صحت یاب موتے مریض کا گلا گھونٹ دیا گیا ہو۔ انجم اس غیر متوقع حملے کے لئے تیار نہ تھی وہ بوکھلا گئی۔

”میں نے کہا تھا نا کہ جوہی کو سنبھالنا تمہارے بس کا روگ نہیں۔ آخر وہی ہوا جس کا مجھے ڈر تھا۔ تمہاری بے پناہ چاہت اور وارفتگی سے میں خوف زدہ ہی تھی۔ آخر کار تمہاری نظر بد نے میری بچی کے چاند سے چہرے پر داغ لگا ہی دیا۔ پیار کے دو میٹھے بول بول کر ہر عورت ماں نہیں بن سکتی۔ مسز آفاق۔ تم کیا جانو ماں کسے کہتے ہیں۔ محبت کے دو جملے تمہیں ماں نہیں بنا سکتے۔ تم اگر سچ محب جوہی کی ماں ہوتیں تو شاید اس کے سر سے بہتے خون کو دیکھ کر تمہارا لہو پانی بن کر بہہ جاتا۔ تمہنے کونسا لے نو ماہ اپنی کوکھ میں رکھا۔ کونسی تخلیق کا کرب برداشت کیا۔ کونسی جاگ جاگ کر راتیں کاٹیں، کونسا اپنا لہو دے کر پالا۔ میں اس کی ماں ہوں، میں نے اسے جنم دیا ہے، اپنا لہو پلا کر اسے پالا۔ بس یہی فرق ہے، تم میں اور مجھ میں۔ تمہیں کیا پتہ ماں کیسی ہوتی ہے۔ جب لہو کا رنگ دودھ میں بدلتا ہے تبھی ایک عورت ماں بنتی ہے۔ بہتر یہی ہے کہ صبح کی پہلی کرن کی آمد سے پہلے ہی میرے گھر سے چلی جاؤ۔“

مسز خاں کسی بادل کی طرح گرج کر برس کر چلی گئیں، اور انجم محسوس کر رہی تھی کہ وہ خون جو بوتل کے سہارے جوہی کی رگوں میں پہنچا گیا تھا صرف پانی تھا صرف پانی، وہ دودھ نہ بن سکا۔ وہ سسک سسک کر رو پڑی۔ شاید مندلی ہوتا زخم پھر سے رکنے لگا تھا۔

# چشمِ نرم

”اللہ کیا سچ بچ وہ آجائیں گے۔۔۔!“ مایوسیوں کے کہر میں ڈوبی، دمِ سی سورج کی کرن کی طرح اس کی آواز ابھر رہی۔

”ہاں ہم نے پڑھا بھی ہے کہ دونوں ملکوں کے اسیرانِ جنگ کا جلد ہی تبادلہ عمل میں آئے گا۔“ شاذیہ اس کے کاندھوں پر ہاتھ رکھے کہہ رہی تھی۔

”لیکن۔۔۔ لیکن اگر ان کے آنے سے پہلے ہی“ وہ رک گئی جیسے اس کے آگے خونِ خوار درندہ منہ کھولے کھڑا ہو۔

”چل ہٹ، ایسی باتیں نہیں سوچنا کرتے ہمیشہ نیک خیالات رکھا کر۔“ شاذیہ نے اس کے رخسار تھپتھپاتے ہوئے کہا۔

”میں کیا کروں شاذیہ، میری نگاہیں خلا میں صرف اندھیرا دیکھتی ہیں۔ اُجالوں کی یہ بوچھاڑ مجھ سے دور ہے۔ جانے وہ کونسا سویرا آئے گا، جو میرے آنچل میں خوشیوں کی کرنیں بکھرے گا۔ تم جانتی ہو نا میں عدنان کی محبت کو عبادت سمجھنے لگی ہوں۔ کیا میرے سجدے قبولیت کبھی حاصل بھی کر پائیں گے یا پھر نشان ہی رہ جائیں گے، میری جبین پر ان سجدوں کو۔“ اس نے نازک انگلیاں جبین پر رکھ لیں، یوں لگا

جیسے سنگ مرمر کے فرش پر ایک ساتھ چار شمعیں جلنے لگی ہوں۔

”میری جان، تم اتنی طویل جدائی کی وجہ سے اس قدر مایوس ہو۔ تم نے عدنان کے لیے غم کو اپنا مستقل سرمایہ بنالیا۔ لیکن یاد رکھو روحا شب کی سیاہی دراصل دن کے اُجالے کے لئے ہی پھیلتی ہے۔ عدنان کو تم سے کوئی چھین نہیں سکے گا، وہ روحا کے لئے ہے اور روحا کے لئے رہے گا۔“ شاذیہ نے روحا کو سینے سے لگالیا۔

”ایک تو ہی تو ہے جو میرے دکھ کے موتی روح میں پرو لیتی ہے ورنہ اس گھر میں سوائے نشتر کی چھین اور آگ کی تپش کے مجھے ظاہی کیا۔“ روحا کی گیسلی آنکھیں چلنے لگی تھیں۔

”روحا، کہاں مرجاتی ہے آخر چوٹے چکی کا بھی کبھی خیال کیا ہے۔ ہمارا نی کالج میں تو کیا پڑھتی ہیں خود کو ریس اعظم سمجھ لیا ہے۔ مرنے والی نے کوئی ماما تو نہیں رکھ چھوڑی تھی جو اس قدر بے پرواہ ہے۔“ یہ روحا کی سوتیلی ماں کی آواز تھی۔ روحا نے لرزتی نگاہوں سے شاذیہ کو دیکھا اور اس لمحے شاذیہ کو بھی محسوس ہوا کہ وہ درخت جس پر ایک پتہ بھی نہ ہو خود کو کتنا بے بس اور اکیلا سمجھتا ہے۔

”روحا یہی صبر کا وقت ہے جا تو اپنا کام کر میں بھی چلتی ہوں۔“ شاذیہ نے ڈبدائی آنکھوں سے الوداع کہا اور گھر سے نکل گئی۔ زندگی دروے کتنی معور ہے، روحا یہ سوچتی ہوئی باہر آئی۔

”شاذیہ آگئی تھی۔ اس سے کچھ دیر باتیں کرنے میں وقت لگ گیا امی۔“

”ہونہہ امی! جانے کس منحوس کو کھ سے پیدا ہوئی تھی اور چلی ہے مجھے ماں بنانے۔ خبردار جو زبان دراز کی“ میدان جنگ کی گولیاں ہمیں برسے لگی تھیں۔

”جی۔۔۔“ وہ گھونٹ نگل گئی۔ کتنا عجیب مزہ تھا پتہ نہیں وہ خون تھا یا آنسو جو اس کے حلق کو تر کر گیا۔

”روحہا۔ وہ دیکھو آفتاب کی کرنوں کی ہلکی سی تہا زت کس قدر دل فریب ہے، جی میں لکاتا ہے کہ دھوپ کی اس چاندی کو تم پر نثار کر دوں۔“ وہ چھت پر کپڑے سکھانے آتی تو عدنان اس کے چہرے کو دیکھتا ہوا کہتا۔

”روحہا۔ اس ماہتاب کو دیکھ رہی ہو کس قدر جگمگاہٹ ہے، اس میں مگر تم تو اپنے آپ میں ہزاروں ستارے سمیٹے ہوئے ہو یہ ہر پل میرے نہاں خانے میں جگمگاتے رہتے ہیں۔“ وہ رات کو بستر کی سلوٹیں درست کرنے آتی تو عدنان کہتا۔

”روحہا۔ تم نے یہ کیوں چرایا سب کچھ۔“

”میں نے — میں نے کیا چرایا۔“ اس نے گردن اٹھا کر پوچھا۔

”آفتاب کی چمک، ماہتاب جگمگاہٹ، شبنم کی تھلکی، سرو کا قد، بادلوں کی سیاہی، پھولوں کی خوش نہائی، دھنک کے رنگ، کلیوں کا دہن، ستاروں کی ضیا، اجالوں کا خمار، جھرنوں کی موسیقی، کہساروں کی دل آویزی آسماں سے لے کر زمین تک پھیلے ہوئے ہر نظارے کا حسن مجموعی طور پر تم نے چرایا، ایسے صنم تو قابل پرستش ہو جاتے ہیں۔“ وہ روحہا کی زلفوں میں گم ہو کر رہ گیا۔

آئینے کے روبرو کھڑی روحہا اپنے عکس کو دیکھتے جاتے کہاں پہنچ گئی اس نے گوندھی ہوئی زلفوں کو جھٹک دیا۔ سیاہ آبشار شانوں سے بہتا ہوا، مگر کو چھونے لگا۔

”عدنان۔“ دل کے کسی گوشے سے دبی ہوئی آواز آئی اور روحہا کو محسوس ہوا جیسے وہ اس نام سے ڈھک گئی ہو۔

”تم نے کیا جواب دیا ہاشم رضا کو۔۔۔۔۔؟“ اس کی سوتیلی ماں نے پوچھا۔

”تم ہی کہو کیا جواب دوں۔ روحہا کا رشتہ تو عدنان سے طے ہو چکا ہے مگر۔۔۔۔۔ اس کے باپ کی آواز یہیں تھم گئی۔

”عذنان کا انتظار کرو گے تو یہ ساری زندگی ہماری چھاتی پر بیٹھی مونگ دلتی رہے گی۔  
کیا پتہ عذنان زندہ بھی ہے یا نہیں۔“ ماں کے اس جملے پر وہ یوں بکھر گئی جیسے پارے  
کی بنی ہو۔

”تو پھر ہاشم رضا سے کہہ دوں کہ ہم راضی ہیں۔“ اس کے باپ نے سوال کیا۔  
”اور نہیں تو کیا — کوئی ایسا بڑھاپا تو ان پر نہیں ٹوٹ پڑا کہ تمہاری روحا  
کا ہی کندھا تھام لیں۔ بال ہی تو سفید ہیں ورنہ گھر تو سونے سے سیلا ہے۔ تمہاری بیٹی  
رائی بن جائے گی، وہاں جا کر، پھر اس کے علاوہ ہمیں قرض سے نجات مل جائے گی۔ وہ  
تو روحا کے بدلے میں ساری رقم بخش رہے ہیں، ایسے کاموں میں دیر ٹھیک نہیں۔“  
اس کی ماں نے سرگوشی کی، ان کے ہاتھ میں سر وہ تھما اور چھالیہ کتر رہی تھی۔  
ادھر روحا کیوں لگا جیسے اس کے دل کے ٹکڑے الگ الگ ہو کر گر رہے ہوں۔

”نہیں۔“ چیخ کر کہنے کے لئے اس کا حلق تھرا یا، مگر جانے کیوں لب  
جنبش ہی نہ کھا سکے، اُس رات وہ پلنگ پر پڑی بڑی دیر تک ماضی کے جھروکوں  
میں گھومتی رہی کتنی حسین دنیا تھی وہ جب اس کی ماں زندہ تھی۔ جب وہ اپنے ماموں  
زاد بھائی عذنان کے ساتھ دن بھر تسلیاں پکڑا کرتی اور شام کو اس کا ہاتھ تھامے  
ڈوبتے سورج کو دیکھنے اس پہاڑی کے جانب جاتی جو اس کے گھر کے پچھلے حصے  
پر تھا۔

”مجھے ڈوبتے سورج کو دیکھ کر بہت دکھ ہوتا ہے کیونکہ جب یہ ڈوبتا ہے نا!  
تو پورے آسماں پر لالی بکھیرتا ہے، ایسی لالی جو خون کی ہوتی ہے، کیا سورج کا بھی  
کوئی قتل کرتا ہوگا۔“ وہ معصومیت سے پوچھتی۔

”ہاں اس کا قتل ہی تو ہوتا ہے۔ شام اس کی قاتل ہے، بے چارہ دن بھر  
تو اُجالا دیتا ہے لیکن شام جانے کیوں اس کی دشمن ہے، جو ہر روز اسے قتل کرتی ہے“

عدنان جواب دیتا۔

”میرا بس چلے تو میں شام کو پکڑ ہی لوں“ وہ کہتی۔

”روحاً تم تو پاگل ہو۔ کیا صبح دوپہر شام بھی کوئی تتلیاں ہیں جنہیں ہم پکڑ لیں۔“  
وہ قہقہہ لگا کر ہنس دیتا۔

سنستے کیوں ہو۔ چلو میرے ساتھ، ہم وہاں تک چلے جائیں گے جہاں یہ سورج لالی بکھیر رہا ہے۔ دیکھیں گے شام وہاں کیسے آتی ہے۔“ روحا نے اس کا ہاتھ تھاما۔

”اتنی دور چل تو تو بیگلی ہے۔ یہ راستہ ختم نہیں ہوگا۔“  
”تو کیا ہوا ہماری عمر جتنی بھی رہے گی ہم اتنی دیر تک ساتھ چلتے رہیں گے۔ اور اسی وقت دم لیں گے، جب شام سورج کا قتل کرنا چھوڑ دے گی۔“ پھر ایک نادان سا جملہ اس نے کہہ دیا۔

”نہ ہم اتنی دور جا سکیں گے، اور نہ یہ شام سورج کو قتل کرنا بند کرے گی۔“  
چلو اب گھر چلیں بہت دیر ہو گئی۔ عدنان اس کا ہاتھ تھامے واپس لے آتا۔  
سیح مخ سورج کا ہر روز قتل ہوتا رہا اور شام آتی رہی وہ دونوں کبھی اس منزل تک پہنچ نہ سکے۔ پھر وہ کرخت صبح آئی جب اس کی ماں کا وجود برف بن گیا تھا۔  
مٹی کے ڈھیر کے نیچے اس کی ماں سو چکی تھی۔ وہ سوچنے لگی لوگ اتنا جھوٹ کیوں کہتے ہیں کہ انسان مٹی سے بنا ہے۔ اگر مٹی اسے بناتی ہے تو پھر یہ منہ کھولے واپس کیوں بلا لیتی ہے۔ دور کسی پیر پر کوئی پرندہ پھڑپھڑا کر اڑ گیا۔ روحا چونک اٹھی گھڑیاں نے دو بجنے کا اعلان کیا۔ وہ کروٹ بدل کر لیٹ گئی، آنکھیں بند ہوئیں تو پھر ایک بار ماضی کی فلم چل پڑی۔

”روحا۔ یہ تمہاری نئی امی ہیں۔“ اس کے ابا نے گرجنے بادلوں کے دن اعلان کیا



اور اسے یوں محسوس ہوا کہ یہ گر جتے بادل کسی طوفان کا پیش خیمہ ہیں۔ دفعتاً بجلی بجی اور اس نے نئی ماں کو دیکھا ان آنکھوں میں اسے وہ چمک نظر آئی جو بلی کی آنکھوں میں اپنے شکار کو دیکھ کر آجاتی ہے۔

”عدنان نئی ماں کیوں آئی ہے۔“ اس نے پوچھا۔

”تمہاری ماں جو بلی گئی اس لئے۔“ یہ دنیا ہے روحا یہاں ایک جاتا ہے تو اس کی جگہ دوسرا آتا ہے۔ عدنان نے سمجھانے کی کوشش کی۔

”تم جھوٹ کہتے ہو۔ اگر تم یہاں سے چلے گئے اور تمہاری جگہ کوئی اور عدنان بن کر آئے تو کیا میں یہ ماں لوں گی۔ نہیں۔“

اس نے گردن جھٹک کر کہا، چند ہی دن میں نقشہ بدل گیا۔ اس کے ساتھ ساتھ عدنان بھی نئی ماں کے ظلم کا نشانہ بنا۔ معصوم اور مظلوم بچپن حسین اور تم رسیدہ جوانی میں بدلا۔ نئی کلیوں کی شگفتگی کی جگہ اس کے چہرے پر خزاں کا سایہ رہا۔

”میں اس کنول کو کیچڑ سے نکال کر ہی رہوں گا۔ عدنان اس کا چہرہ دونوں ہاتھوں سے اٹھائے کہتا۔

”مگر۔۔۔ مگر عدنان وہ تو کیچڑ میں ہی زندہ رہتا ہے تم نے نکالنے کی کوشش کی تو وہ مرجھا جائے گا اور تمہارے کپڑے بھی داغدار ہو جائیں گے۔ روحا لرزتی آنکھوں سے دیکھتی ہوئی کہتی۔

”ہش۔۔۔ مایوسی کفر ہے۔ اوہم ان لمحوں کو خواب کے لئے وقف کر دیں وہ اسے سینے سے لگا لیتا، اور سچ پچ وہ رنگین سپینوں میں کھو جاتی پھر یہ سپنے اس کی ماں کی آواز پر بکھر جاتے۔

آخر کب تک روٹیاں توڑتے رہو گے اپنے چھو پھاکے۔ اب تو سینہ تان کر چلتے ہو۔ بازو برابر کے ہو گئے ہو۔ کچھ تو خیال کرو۔ نئی ماں عدنان کو نواز تیں۔

”میں خود کوشش میں ہوں آپ ہی کہئے جھلا کر بجویشن کرنے کے بعد میں صرف  
بجوشن ہی کیوں کرتا نوکری ملتی نہیں، لوگ منہ مانگی رقم مانگتے ہیں۔ اس میں میرا کیا  
قصور۔“ عدنان اپنی مجبوری بیان کرتا۔

”تو فوج میں ہی بھرتی ہو جاؤ۔“ یہ تیر نشانے پر بیٹھا۔

”روحہ میں ملٹری جوائن کر رہا ہوں۔ تم میرے لئے تو منسوب ہی ہو لیکن پھر بھی  
ایک وعدہ تم سے لینا چاہتا ہوں میرا انتظار کرنا۔“ عدنان یہ کہہ کر چلا گیا۔  
”آہ۔“ ایک سرد آہ اس کے دل سے نکل گئی، کھڑکی سے زرد چاند جھانکنے  
لگا تھا۔ شاید سویرا قریب تھا۔ ہند پاک جنگ چھڑ گئی۔ اس اعلان کے ساتھ ہی وہ  
روحہ کے پاس چلا آیا۔

”میں جا رہا ہوں۔“ اس جدائی کو عارضی سمجھو۔ یہ میری محبت کا پہلا امتحان  
ہے۔ خدا را آنسوؤں کے چراغ جلا کر مجھے وداع نہ کرو۔ تمہاری مسکراہٹ میرے لئے  
دھال رہے گی زندہ بچ گیا تو تمہاری مانگ سجادوں گا، اور اگر واپس نہ آسکا تو مجھے  
بے وفاء سمجھنا۔ اس نے اس کے ہونٹوں پر ہاتھ رکھ دیا۔

”اللہ ایسی دل شکن باتیں نہ کرو۔ تمہاری کامیاب آمد کے لئے میرے لب ہر  
وقت دعا کرتے رہیں گے۔ میری چشم نم تمہاری جدائی کے باوجود امید پر مسکراتی رہے گی۔  
اور سچ مح روحہ کی پلکیں گیلی ہونے کے باوجود اس کے ہونٹ مسکراہٹ رہے تھے۔  
عدنان وداع ہو گیا۔ نئی ماں نے سکھ کا سانس لیا۔ اس کے ابا نے خیر سمجھی اور وہ  
اس پانی کی طرح مضطرب ہو کر جینے لگی جو پہاڑوں کو کاٹتا دھرتی سے ملنے تیزی کے  
ساتھ اوپر سے نیچے کی جانب آنے لگتا ہے۔

ہر روز ریڈیو سے خبریں سننا اور اخبارات کا مطالعہ کرنا اس کی زندگی کا اہم

فریضہ بن گیا۔ ماں کی پھٹکار، باپ کی بے توجہی کے باوجود وہ صرف اپنی سہیلی شاذیہ اور اپنی روح کے مالک عدنان کے لئے جی رہی تھی۔ عدنان کی غیر موجودگی میں ایک شاذیہ ہی تو تھی جو اس کے زخموں پر مرہم لگاتی۔ ادھر چند دن سے ہاشم رضا نے اس کے والد کو تنگ کرنا شروع کیا تھا۔ روحا سے اتنی ہی تو بھول ہوئی تھی کہ وہ ماں کے کہنے پر انھیں چائے دینے کے لئے دیوان خانے میں چلی آئی۔ کہاں تو وہ گرج رہے تھے۔ پیسوں کے لئے، اور کہاں اسے دیکھتے ہی تھم گئے۔

”یہ کون ہے۔“ بڑھی لیکن جویں نظریں روحا کا جائزہ لینے لگیں۔  
 ”یہ روحا ہے میری بیٹی۔“ اس کے ابا نے کہا۔  
 ”روحا۔“ اور اس لفظ کے ساتھ ان کے سارے جسم میں جیونٹیاں رینگنے لگیں۔

”کہیں شادی واوی کی بات ہوئی ہے کیا۔“ انھوں نے نادیدہ نگاہوں سے دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

”بات تو کہیں نہیں ہوئی، البتہ ارادہ ہے کہ عدنان سے نکاح کر دوں وہی جو فوج میں ہے۔ اس کی شادی کے لئے ہم رقم کہاں سے لائیں گے۔ عدنان گھر کا بچہ ہے بنا لیں دین اور جہیز کے شادی ہو جائے گی۔ اس کے ابا نے تفصیل سمجھائی اور اس لمحے روحا کا وجود تڑپ کر رہ گیا۔ اس کی مٹھیاں بھینچ گئیں۔

”اجی تمہاری لڑکی تو حور ہے کون نہیں ملے گا اسے۔“ ہاشم رضا کے گنے چنے دانت باہر آئے۔

نئی ماں قیامت کی نظر رکھتی تھی اس نے تارلیا کہ بوڑھے سا ہو کار کی نظریں سود اور اصل کے بدلے میں صرف ایک عدد نوجوان لڑکی پر میں جو بے وجہ بے صرف بوجھ بن کر ان کے گھر میں پڑی تھی اور جسے بلا سمجھ کر وہ جلد سے جلد ٹالنا چاہتے تھے۔

بات چھیڑنے کی دیر تھی کہ ہاشم رضا بے صبر ہو گئے، انھوں نے قرض میں دی ہوئی رقم معہ سود کے معاف کر دی اور اس کے بدلے نوخیز کلی کو سہاگن کے روپ میں قبول کرنا چاہا۔

روحِ زرد پتے کی طرح لرز کر رہ گئی۔

”ہاے اللہ! یہ کیا مذاق ہے میرے ساتھ۔ کیا انتظار کی لذت بھی میرے نصیب میں نہیں۔ عدنان کے بنا تو موت کا تصور محال ہے۔ پھر جینا کس شمار میں اتنے سنگ دل کیوں ہو گئے یہ دنیا والے۔“ اس کی آنکھیں قطرہ قطرہ ٹپکانے لگیں، دل سمندر بن گیا اور ہر قطرہ وہ سیپ بنا جس میں عدنان کے نام کا موتی چھپا تھا۔

جنگ ختم ہوئی اور اس کا رشتہ ہاشم رضا سے طے ہو گیا۔  
”جنگ تو ختم ہو چکی شاید عدنان آجائیں۔“ بہ مشکل تمام اس نے لب کھولے۔  
”جہنم میں گیا عدنان۔ ضروری نہیں کہ اس سے تمہاری شادی کی جائے۔ ہاشم رضا سے شادی ہوگی تو خود بھی مزے میں رہو گی۔ اور تمہارے آبا بھی ہر اٹھا کر جی سکیں گے۔ تم کیا اپنے آبا کے لئے اتنا بھی نہیں کر سکتیں، لڑکیاں تو خاندان کی عزت کے لئے زہر بھی پی لیتی ہیں۔“ ماں نے کھلم کھلا کہہ دیا۔

”آپ بھی تو مجھے وہ زہر پلا رہی ہیں۔ جس کے اثر سے نہ میں مر سکوں گی اور نہ جی سکوں گی۔ بلکہ ساری زندگی حرفِ تڑپ تڑپ کر گزار دوں گی۔“ اس کے دماغ میں یہ جملہ کھلبلا گیا کہنے زبان کھلی نہیں اور وقت چپکے سے نکل گیا۔

اس کی ماں نے منگنی کا اعلان کر دیا اور جب اسے مہندی لگائی جا رہی تھی تو اُسے یاد آیا کہ سورج کا قتل کیوں ہوتا ہے۔ آسمان پر لالی کیوں بکھر جاتی ہے۔ شام کیوں سورج کی قاتل ہے۔

منگنی کے دوسرے ہی دن شاذیہ نے خبر دی کہ اسیران جنگ کا تبادلہ ہو رہا ہے۔ وہ کانپ گئی، اگر عدنان آجائیں تو۔ اندیشوں نے پکارا، کیا بے وفا کا خطاب میرے نصیب میں ہے۔ وہ بڑبڑائی اور پھر سچ مچ آنکھوں کی سیپ سے بے شمار موتی بہہ نکلے۔ اس کی حالت ایسے زاہد کی ہو گئی جیسے ساری زندگی کی سجدہ ریزی کے بعد کسی نے کافر کہہ دیا ہو۔

اسیران جنگ تو آئے لیکن عدنان کا پتہ نہیں تھا۔ اسی امروز و فردا میں وہ دن بھی آیا جب وہ اپنی تمام تر آرزوؤں اور اربابوں کو اپنے سرخ آنچل میں لپیٹ کر ان کا خون کر چکی تھی، سرخ جوڑا پہنتے ہوئے بھی اُسے سورج کا قتل اور آسمان کی لالی یاد آگئی۔

”آخر عدنان میرے ہمسفر بن نہ سکے، تم نے میرا ساتھ ہی نہ دیا نہ سورج کو بچانے اور نہ شام کو بھگانے، جو سورج کی قاتل ہے۔“ وہ گھونگھٹ کی آڑ میں خود سے بولتی رہی۔ رات گہری ہوئی تو اُسے مقدر کی سیاہی کا احساس ہوا۔ روحا دلہن تو بنی مگر اس کے چہرے پر سہاگنی کے رنگ کے بدلے بیوگی کا رنگ تھا۔ یہ احساس اسے بار بار کچھ کے لگتا کہ اس نے عدنان کو دھوکا دیا۔ کیا کبھی تھی اُسے ہاشم رضا نے اس کے پیروں تلے چھل بچھایا تو گردن تلے نگیٹے جڑ دیئے، لیکن چاہے کنول کو سونے کے گلدان میں ہی کیوں نہ سجا دو، بنا پانی کے وہ مرجھا جاتا ہے۔ یہی حال روحا کا ہوا۔ اس شام جیسے اس کے میدان دل پر گولیوں کی بوچھاڑ ہو گئی۔ جب اس نے شاذیہ سے یہ سنا کہ عدنان آیا ہے اور اس سے ملنے بے قرار ہے۔

عدنان، عدنان، عدنان، جسم کا ہر رواں گویا ہوا، اب کیا ہوگا۔ “ اس کا چہرہ زرد ہو گیا، کسی پکے ہوئے پھل کی طرح۔ ”ان وعدوں کا کیا کروں، اس چشمِ نفم کو کیسے چھپاؤں؟“ آئینے کے روبرو کھڑی وہ اپنے آپ سے کہہ رہی تھی۔

”بے وفا، سنگ دل، دغا باز، فریبی، خود غرض، بزدل، مکار، دولت پرست  
جیسے آئینے کو زبان مل گئی۔  
”نہیں۔ نہیں۔“ اس نے کانوں پر ہاتھ رکھ لئے، ماتھے پر ہزاروں  
شکلیں ابھر آئیں۔ وہ پلنگ پر گر پڑی۔

دُور پہاڑی کے پیچھے سورج ڈوب رہا تھا۔ آسمان پر گہری سرخی پھیل چکی تھی۔  
پرند اس سرخ شام سے گھبرا کر اپنی پناہ گاہوں کی جانب پرواز کرنے لگے تھے۔ روحا  
گلابی ساڑی باندھے سیاہ آونی شال کاندھوں پر ڈالے زلفوں کو آوارہ چھوڑے  
اس پہاڑی کی جانب جا رہی تھی۔ بچپن کی وہ بات اسے رہ رہ کر یاد آنے لگی۔  
”عدنان سورج کا قتل کیوں ہوتا ہے۔؟ شام کیوں اس کی دشمن ہے؟“  
اس کے قدم آگے بڑھتے رہے۔ پہاڑی کے اوپری حصے تک پہنچنے کے بعد اس  
نے نظر اٹھائی، آسمان اب اُداس ہونے لگا تھا۔ چاندی کی گول ٹمکیہ اس اُداس  
آسمان کے ماتھے پر چمکنے کے لئے دھیرے دھیرے آرہی تھی۔ شاید اُس کے غم کو  
اپنی بانہوں میں لے لینا چاہتی ہو۔

”تم آگئیں۔“ عدنان کی آواز پر اس کے خیالات کا دھارا ٹوٹ گیا۔  
اس نے مڑ کر دیکھا۔ وہ اس کے بہت قریب تھا۔ خود اس کے دل کی دھڑکن بھی  
عدنان کے مقابلے میں اس سے دُور ہو گئی مگر.....  
”کیا فائدہ؟“ وہ بے دلی سے مسکرا پڑی۔

”میں نے تم سے اپنے وعدوں کا حساب طلب کرنے یا تمہاری امید سے پرچشم  
کو دیکھنے یہاں نہیں آیا بلکہ زندگی کی نامکمل تصویر کو مکمل دیکھنے کے لئے بلوایا ہے۔  
کہو کیسے گزرے تمہارے شب و روز؟“ عدنان نے پوچھا۔

”میری یہ ارٹتی ہوئی زلفیں میرے شب تاریک کی گواہ ہیں، اور میری آنکھوں کی یہ اُداسی روزِ سیاہ کی غماز ہیں۔“ وہ سر پایا درو بن گئی۔ ”میں نے کتنی راتیں اشک میں ڈبوئیں، اور کتنے دن انہوں کے دھوئیں میں گزارے کہہ نہ سکوں گا۔“ عدنان کا غم بھی لُبلنے کو تھا۔

”خدارا، ایسے لمحات کو اب بھول جاؤ۔ آج تم نے مجھے بلایا میں خطا وار کھڑی ہوں جو کچھ ہو گیا اس کے بارے میں کچھ نہ پوچھو، سزا تجویز کرو مجرم تمہارے آگے ہے۔“ اس نے سر جھکا لیا۔

”روحاً، تم نے کبھی شمع کو اپنی لو بجھاتے ہوئے دیکھا ہے۔ محبت کرنے والے اتنے بے درد تو نہیں ہوتے۔“

”نہیں عدنان، مجھے اور بکھرے نہ دو۔ یہ تمہارا ظرف ہے کہ تم بخش رہے ہو، مگر سچ پوچھو تو میں نے تمہارے ارمانوں کے ہزار پر اپنی ازدواجی زندگی کی بنیاد کھڑی کر لی۔ زندگی بڑی تیز رفتار ہے، ہم اور تم اس بہاؤ میں خس و خاشاک کی طرح بہہ گئے۔ کل ہمارے ہاتھ ایک دوسرے کے ہاتھ میں تھے، اور آج ہماری آنکھیں بھی ایک دوسرے کو دیکھ نہیں پا رہی ہیں۔ خیر! کچھ ہو میں ناقابلِ معافی ہوں۔ مجھے آج سزا سے محروم نہ کرو۔ گھونٹ دو میرا گلا۔“ رکا دو میری سانسوں کو، بند کرو میری نگاہوں کو، خاموش کر دو میرے لبوں کو۔ آگے بڑھو، عدنان آگے بڑھو۔“ روحا نے سچ پچ عدنان کے ہاتھ اپنی گردن پر رکھ لئے، اور عدنان کو محسوس ہوا جیسے کسی پیاسے رند کے آگے کسی نے جام تو رکھا لیکن خالی۔

”روحاً۔“ اس نے روحا کو سنبھال لیا۔ ”یہ حادثات ہے زمانے کے۔ تم میرا انتظار نہ کر سکیں اور خود کو اس کے لئے خطا وار سمجھا، لیکن میں بھی تمہارا مجرم ہوں۔ اب روحا کی گیلی پلکیں اوپر اٹھیں۔“

”ہاں روحا۔ میں تم سے جھوٹ نہیں کہہ سکتا، عجیب اتفاق ہے کہ تم ادھر مجبوری حالات سے ہاشم رضا کی ہو گئیں اور میں نادانستہ سحر کا۔“

”سحر۔!!“ روحا نے پھر ایک بار آسمان کی طرف دیکھا، وہاں سحر کا پتہ نہیں تھا بلکہ آسمان تاروں کے بن میں بدل چکا تھا۔

”یہ سحر ہے۔“ عدنان نے گوشت پوست کے سانپے میں ڈھلی ایک معصوم شکل کو روحا کے آگے کھڑا کیا۔ سچ مج وہ سحر ہی تھی۔ عدنان کہہ رہا تھا اور روحا سحر کو سیکے جا رہی تھی۔

”تم سے ملنے کی بے تاب تمنا نے مجھے فرار پر اکسایا۔ اور میں اپنے چند ساتھیوں کے ہمراہ قید خانے سے فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا۔ مگر شوقی قسمت کہ ہمارے اس فرار کا علم دشمنوں کو ہو گیا اور ہم گولیوں کی زد میں آ گئے۔ میرے دیگر ساتھیوں نے تو زندگی سے فرار حاصل کر لی مگر میں شدید زخمی حالت میں پچھتے پچاتے ایک سنسان مقام پر جا کر بے ہوش ہو گیا۔ اٹھ دن بعد آنکھ کھلی تو سحر میرے سامنے تھی۔ یہ وہی لڑکی ہے جس نے مجھے نئی زندگی دی، اس کا اس دنیا میں کوئی نہیں۔ صرف ایک اپاہج باپ تھا۔ جب میں نے بوقت رخصت ان کی اس خدمت کے معاوضے میں انسانیت کے نلٹے یہ پوچھا کہ میں ان کی کیا مدد کر سکتا ہوں تو انھوں نے سحر کو میرے سامنے لاکھڑا کیا۔“

یہ سحر ہے مگر سچ پوچھو تو شب تاریک، نہ بول سکتی ہے اور نہ سن سکتی ہے میری زندگی کی کل پونجی یہی ہے۔ جب سے اپاہج ہو گیا ہوں۔ اس ویرانے میں بس گیا ہوں سحر میری لاکھی ہے۔ یہ ہر روز شہر جا کر ترکاریاں بیچ آتی ہے جو میں نے گھر کے بھوپاڑے میں اگائی ہیں۔ آج تین سال سے ہم اس ویرانے میں آباد ہیں اور میری بوڑھی نظریں ایسے ہی انسان کی تلاش میں کھلی ہیں جو میری بچی کا ہاتھ تھام سکے۔ تم اتفاق سے یہیں مل گئے۔ اگر تم نے سحر کو اپنا لیا تو میں سکون سے مر سکوں گا یہ ساری زندگی صرف تمہاری خدمت



میں گزار دے گی، مگر حرف شکایت اس کی زبان پر نہ آئے گا۔“

”میرے لئے عجیب کشمکش تھی، ادھر تمہاری چشمِ نم کا خیال آتا اور ادھر سحر کی بیکسی کا۔ ان کے کئے ہوئے احسانوں کا۔ میں سوچ میں پڑ گیا۔ رات کی تاریکی میں سحر کی سسکیاں مجھے جگاتی رہیں، اور دوسرے ہی دن میں نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ اس کا ایاہج باپ اس خوشی کی تاب نہ لاسکا اور اس کا اس دنیا میں سوائے میرے اور کوئی نہ رہا۔ میں ہاتھ تھامے اسے تمہارے پاس لے آیا ہوں۔ تم اوروں کا غم سہنے کی صلاحیت رکھتی ہو تمہارے دل میں بھی درد کی تپش ہے۔ میری مجبوری اور اس کی بیکسی کو سمجھو گی تو خود ہی مجھے بخش دو گی۔“

عدنان کے اس انکشاف پر وہ مبہوت ہو گئی۔ اس کے ماتھے پر موتیوں کی لڑیاں چمک رہی تھیں۔ سانس کا اتار چڑھا دیتا رہا تھا۔ اس نے آگے بڑھ کر سحر کو گلے لگا لیا، مگر دوسرے ہی پل اس کی گردن جھولنے لگی۔

”روحہ۔“ یہاڑی کا گوشہ گوشہ عدنان کی آواز پر لرز گیا۔ عدنان نے اسے سنبھالا۔ اس کی آنکھیں کھلی تھیں، آنکھوں میں دو آبدار موتی چمک رہے تھے، شاید بوقتِ رخصت ساغر چھلکنے کو آگئے ہوں۔ اس کے لبوں پر مسکراہٹ تھی۔

”روحہ۔ یہ کیا ہو گیا تمہیں۔“ عدنان نے اسے لٹا دیا۔

”عدنان۔ سحر کو اپنا کر تم نے محبت کو عبادت کا درجہ دے دیا اور مجھے دیکھو میں نے۔۔۔۔۔ میں نے محبت کو رسوا کر دیا۔۔۔۔۔ نہ اپنے لئے جی سکی، نہ اوروں کے لئے۔ یہ شیشی دیکھ رہے ہو۔ روحہ نے اپنی شال ہٹا کر زہر کی خالی شیشی نکالی۔

”یہ تم نے کیا کر دیا روحہ۔ کیا کر دیا۔۔۔“ عدنان یوں پھوٹ گیا جیسے کوئی پکا ہوا زخم نشتر لگتے ہی بہنے لگتا ہے۔

”..... عدنان ..... مجھے تم سے آنکھ ملانے کی بہت نہیں تھی۔ اس لئے.....

اس لئے میں نے..... میں نے..... خیر چھوڑو، مگر میں بہت خوش ہوں.....  
بہت خوش..... میری چشم نم ہو کر بھی مسکرا رہی ہے۔“ اور سچ مح عدنان نے دیکھا۔  
سر مرگاں چراغ جل رہے تھے۔

و فقائے چراغ بوند بن کر ڈھلک گئے۔ دور آسماں سے کوئی تارہ ٹوٹا اور زمین  
کی پنہائیوں میں گم ہو گیا۔

”روحا —“ عدنان کی آواز نے کہساروں کو دہلا دیا۔ سحر نے اپنا انچل  
روحا کے بے جاں جسم پر ڈال دیا۔ کائنات گہری تاریکی میں ڈوب چکی تھی۔



## ”..... اور ہم اکیلے ہیں“

میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو زندگی بڑی تیز رفتاری سے آگے بڑھ چکی تھی اور میں ۔۔۔ جہاں کا وہیں تھا۔ وہی سڑکیں وہی شور و غل وہی پھول کی دوکان اور وہی گلاب ۔۔۔ گلابوں کے اس انبار میں تمھارا صبح چہرہ مسکرا رہا تھا اور میں آنکھیں بند کئے اُن لمحات کو واپس بلانے لگا جو میری زندگی کا انمول سرمایہ ہیں۔

یہ اُن دنوں کی بات تھی جب تم اپنی کار میں کالج جاتے ہوئے ایک پل کے لئے رکتیں۔ گلاب خریدتیں اور پھر تمھاری کار فرائے بھرتی آگے نکل جاتی۔ میں ہر روز مقررہ وقت پر اپنی دوکان میں ہوتا۔ آنکھیں تمھاری راہ نکلتیں۔ گلاب تمھارے رخساروں رنگ چرانے بے قرار رہتے۔ تم ایک پل کے لئے رکتیں گلاب خریدتیں اور گزر جاتیں اور میری زندگی اُس خاص وقت کی بانٹھوں میں کس کر رہ گئی۔ وہ لمحہ وہ ابدی لمحہ میرے لئے زندگی بن جاتا۔ اور میں حسین سپنوں کے جال میں الجھ کر خوش ہو جاتا۔ ایک مفلس انسان اپنے تصور کے تئیں خوشی پاسکتا ہے کیوں کہ خواب اور تعبیر بیک وقت اُس کے صحنے میں نہیں آسکتے۔ ہر پھٹی کا دن میرے لئے مصیبت بن جاتا۔ دل چاہتا دوکان ہی بند رکھوں مگر چا چا کا دھندا میں کیسے بگاڑتا۔ بہر کیف میری زندگی کا بس ایک ہی معمول تھا صبح تمھارا انتظار کرنا، گلاب تمھارے ہاتھ تمھارا دینا اور دور تک جاتی ہوئی کار



کمرے میں داخل ہوا۔ شان دار مسہری پر تم زرد گلاب بنی بیٹھی تھیں۔ میں نے ایک لمحے کے لئے محسوس کیا کہ یہ بھی باغ کا ایک گوشہ ہی ہے جن میں میں زرد گلاب تلاش کر رہا ہوں۔ چوڑیوں سے کھنکھاتی تمھاری کلائی نے جنبش کھائی۔ تمھارے میخانوں نے آواز دی بند کلیاں چٹکیں۔

”یہاں آؤ“ میرے کانوں میں گویا بہ یک وقت مسجد کی اذان مندر کی ناقوس اور چرچ کے گھنٹے بج اٹھے۔ میں ایک لمحہ کے لئے بت پرست بن گیا۔ مگر وہ لمحہ بھی ابدی نہ ہو سکا۔ ”سنو۔ کل شام کار تمھاری دوکان پر آجائے گی۔“ اُسے صرف سفید گلابوں سے سجا دینا ”تم نے شرما کر ٹھکی ٹھکی نظروں سے کہا۔

”جی“ میں بس اتنا کہہ سکا۔

چنڈا۔ انہیں بیٹھائی لا کر دو۔ تم نے آواز دی۔ میرے لئے سفید گلاب رکھو گے نا۔۔۔۔۔! پہلی بار تم نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پوچھا۔ میں کیا کہہ سکتا تھا کیوں کہ اس وقت تو میں باغ بہشت کی کلگشت میں مصروف ہو چکا تھا ایک بہ یک جیسے میں نے چونک کر پوچھا۔

”میم صاحب۔ اب میرے گلابوں کا کون خریدار رہے گا۔“

وہ شرمیلی سی ہنس پڑی ماحول میں انار چھوٹ گئے۔ سخت دھوپ میں گویا سایہ ابر چھا گیا۔ میں خود کو شبنم میں بھیگتا محسوس کر رہا تھا۔ ”خریداروں کی جہاں میں کمی نہیں۔ دوکان سجائے رکھو خریدار آتے رہیں گے۔“ اتنا کہہ کر تم نے گھونگھٹ سرکا لیا۔ شاید کوئی آ رہا تھا۔ اور میں بدلی کے اس چاند کو اپنی نگاہوں میں بھرتا ہوا اٹھ گیا۔

میرا ذل غیب سے جذبات کا شکار تھا۔ کچھ خوشی بھی اور کچھ غم بھی۔ یہ کیسی محبت تھی یہ کیسی دیوانگی تھی۔ یہ کیسا شعلہ تھا جو صرف مجھ کو جلا لے جاتا تھا۔ اس طعن میں کیسی خنکی تھی کہ زخم رس رس کر بھی بھر رہا تھا۔ اس جنون کا میں کیا نام دوں۔

نہ محبت، نہ پیار، نہ اُلفت، نہ چاہت، تو پھر یہ کیا ہے۔۔۔ کیا اسی سخی لاعمل طلب فضول، ذوق بے قیض اور شوق نامرادی کا نام ہی عبادت تو نہیں، پرستش تو نہیں، پوجا تو نہیں۔۔۔ امیرا ذہن نار سا ہو گیا۔ تمھاری نگاہ میرے سینے کا مقصد بن گئی۔ بس میں اسی میں خوش تھا کہ ان آنکھوں نے جیسے جی جنت دیکھی۔ دودھ اور شہد کی نہریں ہونٹوں سے بہتے دیکھی۔۔۔۔۔ چاند کی آب و تاب، بجلی کی ٹپ شبیہ کی نمی، شفق کی گل رنگیاں گویا قدرت پیکر انسانی میں ڈھل گئی۔ میں خود سے بے خبر ہو گیا۔

سُرخ رنگ کی اسپالہ کو سفید گلابوں سے سجاتے ہوئے میں تصور میں ہزار جان سے تمھارا صدقہ اتارتا رہا۔ رات کے پچھلے پہر میں نے بارات دیکھی گلابوں کی بارات۔۔۔۔۔ دل تڑپ اٹھا۔ نظریں طواف کر کے رہ گئیں۔ لب جنبش نہ کھاسکے۔ قدم اٹھ نہ سکے۔ اب تم کسی کی میراث بن چکی تھیں۔ میں نے سانسوں کے اتار چڑھاؤ میں ہی تم کو وداع کر دیا۔ بے شمار دعائیں دل سے نکل گئیں۔ وقت میرے لئے ساکت ہو گیا۔ دن گذرا، رات آئی۔ شوق دیدار کی جو شمع میری نگاہوں میں جلتی تھی، اُس کی ٹوٹی ہوئی نہیں بلکہ اور تیز تر ہو گئی۔ میری دوکان میں گلاب تو تھے مگر جسے زندگی سے محروم ان کی ساری شگفتگی تم لوٹ کر لے گئیں۔ بہاروں میں یہ کیسی خزاں آگئی میں سمجھ نہ سکا۔

تم کون ہو میرے لئے۔۔۔؟ ہم دونوں کے بیچ یہ کونسا رشتہ ہے۔ لاکھ کوشش پر بھی اس کو جگے رشتے کا میں پتہ نہیں لگا سکا۔

میری تنہائی اور مایوسی کو دیکھ کر چاچا نے میرے لئے ہم سفر کی تلاش شروع کی مگر میں نے انکار کر دیا۔ بس اتنی سی بات پر کہ میں تصورات کے وہ قیمتی لمحے تنہائی کی وہ حسین یادیں کسی اور کو دے کر اپنے بیش بہا سرمایے کو لٹا نا نہیں چاہتا تھا۔



رنگ دُنوا میں ڈوب گئی ہو۔ تمھاری خوشی میری زندگی اور تمھارا دیدار میری حیات کا حاصل تھا۔

خوشیوں کی روپیلی کرفوں میں کہیں سے اندھیرے کا کوئی پرتو پڑ گیا۔ تم اُداس ہو گئیں۔ تمھارے مسکراتے لب مُر جھا گئے۔ آنکھوں کی چمک ماند پڑ گئی۔ پہرے کا چاند بدلیوں میں ڈوبتا دکھائی دینے لگا۔ اب تم نے کار روکنی بھی پھوڑ دی تھی۔ یوں خاموشی سے گزر جاتیں کہ میرے اطراف موت کا سناٹا سا پھیل جاتا۔ میری دوکان کے گلاب پھر ایک بار اپنی تازگی کھونے لگے۔ مجھ سے رہا نہ گیا اور ایک دن میں تمھاری کار کے آگے کھڑا ہو گیا۔

”میم صاحب میرے گلاب مُر جھا رہے ہیں۔“ آخر کار میں نے کہہ دیا۔  
تم بے دلی سے مسکرا پڑیں۔ ”کب تک تمھارے گلابوں سے خود کو سنوارتی رہوں۔ میرے اپنے چین میں تو ایک گلاب بھی نہ کھل سکا۔“ اور پھر تمھاری کار تیزی سے آگے بڑھ گئی۔ میں نے حساب لگایا۔ پانچ سال گزر چکے تھے اور میرے نزدیک یہ پانچ برس گویا پانچ ہی دن تھے۔ کیا وقت اس طرح ہر لگا کر اڑ جاتا ہے مگر نہیں میرے لئے تو یہ تھا ہوا ہے۔ میں کل بھی وہی تھا آج بھی وہی ہوں۔ تم کل بھی وہی تھیں اور آج بھی وہی ہو۔ پھر یہ تبدیلی یہ اچانک خاموشی اُداسی، کیا سبب ہے اس کا۔ اس گرہ کو بھی میں کھول نہ سکا۔

آخر کار جب کئی دن لگاتار تمھارا دیدار نہ ہو سکا تب میں پھر ایک بار سفید گلابوں کو ہاتھوں میں سجائے تمھارے گھر کے سامنے آ گیا۔

”کیوں آئے ہو۔“ تمھارے تیور بدلے ہوئے تھے لبوں میں شہد کی مٹھاس نہ تھی۔

”میم صاحب۔ یہ پھول آپ کے۔۔۔۔۔ قبل اس کے میں کچھ اور کہتا



تم برس پڑیں۔

”پھر گلاب۔ گلاب۔ گلاب۔ تنگ آجکی میں اس سوغات کے۔ مجھے نہیں چاہئے پھول لے جاؤ اسے واپس پھینک دو کہیں اور سنو آئندہ پھر کبھی ان گلابوں کو لے کر میرے پاس مت آنا۔ کیوں جلاتے ہو مجھے۔ کیوں دل دکھاتے ہو میرا۔ کیا مانتا ہے تمہیں مجھے اس طرح دکھ دے کر جاؤ۔ انہیں میرے سامنے سے لے کر جاؤ مجھے ان سے نفرت ہے نفرت ہے۔“ تم پھپھک پھپھک کر رو پڑیں۔ میں سر جھکائے سنتا رہا۔ ایک قدم بھی ہلانے کا مجھ سے۔ ایک پل کے لئے تم نے آنسو پونچھ دے اور مجھ سے کہا۔

”تم مجھے گلاب دے کر خوش کرنا چاہتے ہو نا۔ تو جاؤ۔ کوئی ایسا گلاب لے آؤ جو میرے دل کے آئینے میں کھلا رہے۔ جس میں معصومیت کی خوشبو ہو۔ بچپن کا رنگ ہو۔ اور جس کی ہر پتی بس ایک ہی بات دہرائے ماں۔ ماں۔“ تم چھوٹ چھوٹ کر روتی ہوئی اندر چلی گئیں۔ میں اب تمہارے غم کو سمجھ چکا تھا۔ اپنے ہاتھ میں رکھے سارے پھول میں نے تمہارے گھر کے آئینے میں ہی توڑ کر پھینک دے۔ بھلا تمہاری آنکھ میں آنسو دیکھنے کی مجھ میں ہمت تھی۔ میں دیوانہ وار گھر سے نکل پڑا۔ یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے یہی گلاب اب مجھے کانٹے کی طرح کھسکنے لگے ہیں۔

اُس رات میں نے پہلی بار دُعا مانگی۔ گر گڑا کر بھیک مانگی۔ درود کو طلب کیا۔ آہ وزاری میں شب گزردی۔ بس ایک ہی دُعا لبوں سے نکلی۔ ”یا اللہ۔ میری جنت کو مجھ سے چھین نہ لے۔ اس باغ بہشت میں گل کھلا دے۔ تجھے پاکیزگی مریم کا واسطہ۔ ایک گلاب اس کے دامن میں بھی ڈال دے۔ میری دُعا کو بے اثر نہ کر۔ اُسے تخلیق کا کرب عطا کر۔ اُس کے وجود کی تکمیل کر۔ اگر

اُس کے مقدر میں یہ نکتہ نہیں تو پھر اس دُکھ سے پہلے مجھے اٹھالے۔ اگر کسی کی آمد کے لئے یہ شرط تو نے اور دکھ دی کہ موت کا خراج ہی لے تو اس کے لئے میرا وجود حاضر ہے۔ اللہ ! مجھ گناہ گار کی فریاد سن لے۔

میں نے تڑپ کر سچے دل سے دعا مانگی تھی۔ اور یہ حقیقت ہے کہ دل سے مانگی ہوئی چیز مل جاتی ہے۔ کچھ ہی دن بعد اس حقیقت کا مجھ پر انکشاف ہوا کہ تم ماں بننے والی ہو۔

میں نہال ہو گیا۔ میرا دواں دواں خوشی سے بھوم اٹھا۔ میرے اللہ نے میری سن لی تھی۔ چلو یہ تو اعتبار آیا کہ مجبوروں کی بھی وہ سن لیتا ہے بے شک کرم والا ہے۔ پھر میں سپنے سجانے شروع کئے۔ اپنی دکان میں سبجے ہوئے گلابوں کے سبجے تمھارا مسکراتا چہرہ دکھائی دیتا اور پھر دوسرے ہی پل کسی معصوم کی صورت نگاہوں میں گھوم جاتی دے بھی تو ایسا ہی سفید گلاب تھا روئی کے گالے کی طرح۔

جس دن تمھارا آپریشن ہونے والا تھا۔ میں سویرے ہی سے اسپتال کے گیٹ کے قریب ٹھہر گیا۔ میرے ہاتھوں میں سفید گلاب سے سجائے ہوئے دو خوبصورت گہنے تھے جنھیں میں تمھیں پہنانے آیا تھا۔ میری اتنی ہمت کہاں تھی کہ میں تم تک رسائی پاتا۔ پھر بھی قدرت کو مجھ پر رحم آ ہی گیا۔ تمھارا نوکر میری تلاش میں دوکان گیا تھا اور وہاں سے واپس لوٹ رہا تھا کہ مجھے اسپتال کی گیٹ کے قریب موجود پا کر چلا آیا۔

”میں تمھارے لئے کہاں کہاں جا کر آیا ہوں۔ چلو تمھیں میم صاحب بلا رہی ہیں“ اُس نے کہا اور میں دیوی کے درشن کو چل پڑا۔ تم اسٹریچر پر سفید چادر اوڑھے لیٹی ہوئی تھیں۔ مسکرا کر مجھے دیکھا اور اشارے سے اپنے پاس بلایا۔

”میم صاحب“ میں اس کے آگے کچھ کہہ نہ سکا۔

”مجھے تمھارا انتظار تھا“ یاد ہے ایک بار میں نے تمھارے گلابوں سے

نفرت کی تھی مگر اب پھر سے پیار کرنے لگی ہوں۔ اب تمہارے گلابوں کے وہ خرید رہے ہوں گے ایک میں اور دوسرا آنے والا تھا گلاب۔ اب ہر روز اُس کے پالنے کو سجانے ان گلابوں کو لے کر آنا۔ تم نے مجھ سے کہا۔

”میم صاحب میں تو آج ہی انہیں لے آیا ہوں ایک آپ کے لئے اور دوسرا اپنے ننھے مالک کے لئے۔“ میں یہ مشکل تمام کہہ سکا۔ قبل اس کے کہ میں پھولوں کا گہنا تمہارے گلے میں ڈال کر اپنی دیرینہ حسرت کی تکمیل کر لیتا تھا میں آپریشن تھیر کی طرف لے جایا گیا میں امید و بیم کا دامن تھلے، خوش آمد مستقبل کے سپنے سجانے انتظار کرنے لگا۔ وقت گذرا۔ ڈاکٹر باہر آئے۔ سفید کپڑوں میں لپٹی ہوئی کوئی کلبلاقی سے چیز ان کی گود میں تھی۔ میں نے نظر بھر کر دیکھا۔ ان گلابوں سے کہیں حسین گلاب تم نے کھلا دیا تھا۔ تمہارا آنگن جہک اٹھا اور میں بارگاہِ خداوندی میں سجدہ ریز ہو گیا۔ تبھی کسی کے چیخنے کی آواز پر میرا دل دھڑک کر جیسے رُک گیا۔

”ہم نے بہت کوشش کی مگر۔۔۔۔۔ خدا کی مرضی کے آگے بندے کو جھکنا ہی پڑتا ہے۔“ ڈاکٹر کہہ رہا تھا۔ میری آنکھیں گویا پتھر اگئیں۔ میں نے دیکھا تمہارا چہرہ سفید چادر سے ڈھانک دیا گیا تھا۔ ”ہیں۔۔۔۔۔ نہیں۔۔۔۔۔ نہیں۔۔۔۔۔“ میں دیوانہ وار چیخ اٹھا۔ ”میم صاحب۔ تم نہیں جاسکتی۔ تم نہیں مر سکتی۔“ میں نے تمہارے چہرے سے چادر کینچ دی۔ تم مسکراتی ہوئی آنکھیں بند کئے پڑی تھیں۔ پھولوں کا وہ گہنا جو میں لے آیا تھا تمہاری گردن کے اطراف ہالہ کئے پڑا ہوا تھا۔ گویا آج پتہ چلا کہ ہر پھول سہرے کے لئے نہیں کھلتا، چند میت پر چڑھانے کے لئے بھی کھلتے ہیں۔ مجھے یوں لگا جیسے بھری پہنار کو خزاں نے لوٹ لیا ہو۔ میری ہر حس مرچکی تھی۔

جب ہوش آیا تو میری دنیا لٹ چکی تھی۔ موت کے ہیبت سائے میرے اطراف منڈلا رہے تھے۔ میری جنت لوٹ لی گئی تھی۔ میں خانماں برباد تھا۔ دور کہیں دل کے کسی

گوشے سے تمھاری آواز آئی۔

”آج میرے لئے پھول نہیں لادو گے۔“ اند میں اٹھ کھڑا ہو گیا۔

ٹوکرے میں گلاب رکھے اور قبرستان کا رخ کیا۔ کچی مٹی کی ’نئی‘ فولی قبر مجھے اپنے پاس بلا رہی تھی۔ میں نے گلابوں کی چادر سے قبر ڈھانک دی۔ کچھ دیر آنسو ٹپکا کر چراغ جلاتا رہا۔ پھر واپس چلا آیا۔ اُس گلاب کے پاس جو خزاؤں میں کھلا تھا۔ ہاں اب یہی تو میرا مقصد تھا۔ تمھارے اس گلاب کو سینے سے لگا لیتا تو محسوس ہوتا کہ میری جدت لٹ کر بھی میری ہی ہے۔ اب میرا یہی تو معمول ہے۔ ہر روز تمھاری قبر کو گلابوں سے ڈھانک دیتا اور پھر تمھارے آنگن میں کھلے اُس گلاب کو سینے سے لگا لیتا شاید عبادت ایسی بھی ہوتی ہے۔ میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو زندگی بڑی تیز رفتاری سے آگے بڑھ رہی تھی۔ اور ہم وہی اکیلے ہی اکیلے ہیں۔